عبدالغنی خان: حیات وخدمات

سید وقار علی شاہ (کاکاخیل)

جدید پشتو ادب میں غنی خان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ عصر حاضر کا ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ غنی ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے۔ غنی ایک ممتاز مجسمہ ساز، ایک بہترین مصور ہونے کے علاوہ ایک سیاسی مدبر کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے تھے۔

غنی کی تصنیفات کا بیشتر حصہ پشتو میں ہے۔ ذیل میں ان کی حیات وخدمات کا ایک تفصیلی جائزہ اردو میں پیش کیا گیا ہے تاکہ پشتو سمجھنے والوں کے علاوہ اور لوگ بھی ان کی بھرپور زندگی، ان کی رنگین شخصیت، تصنیفات اور قومی خدمات سے مستفید ہوسکیں۔

اس مقالے/مضمون کی تیاری میں غنی سے کیے گئے انٹرویو، ان کی اپنی تصانیف، مجلّہ ''پختون'' پختون (اتمان زئی)، کے علاوہ اس وقت کے اخبارات، سی آئی ڈی کے خفیہ ریکارڈ اور میرے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس وقت کی چند اور اہم تصانیف بھی وقتاً فوقتاً استعمال کی گئی ہیں۔

عبدالغنی خان جو پشتو ادب کی نابغہ روزگار شخصیت تھے ۱۴ جنوری ۱۹۱۴ء کو ہشت نگر (چارسدہ) کے اتمان زئی نامی گاؤں میں عبدالغفار خان (جنہیں عقیدت کی بنا پر باچا خان بھی کہا جاتا ہے) کے گھر پیدا ہوئے[1]۔ والدین کی پہلی اولاد تھی لاڈ و پیار سے پرورش ہوئی۔ گھر میں دولت کی فراوانی تھی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کی جانے لگی۔ شاید اللہ تعالیٰ کو غنی کا یہ ناز و نعم سے پالا جانا زیادہ دیر تک منظور نہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۹ء) کے خاتمے پر ہندوستان اور آس پاس کے ملکوں میں انفلوئنزا کی وباء پھیلی۔ جنگ نے پہلے ہی لوگوں کو

نیم مردہ کر رکھا تھا رہی سہی کسر اس وبا نے پوری کر دی۔ پورے گاؤں میں وبا پھیل گئی اور شاید ہی کوئی گھر اور علاقہ اس کے اثرات سے بچا ہو۔ باچا خان کے گھر میں پہلے باچا خان خود بیمار ہوئے لیکن جلد ہی صحت یاب ہو گئے۔ ان کے بعد غنی کا نمبر تھا۔ پانچ سالہ غنی بیمار پڑ گیا۔ ہر چند کوششیں کی گئیں لیکن بچے کی بیماری دن بدن بڑھتی گئی۔ ماں کو بچے سے بے حد محبت تھی۔ سارا گھر پریشان تھا۔ غنی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ایک دن اچانک پتہ نہیں ماں کو کیا خیال آیا کہ بیٹے کی چارپائی کے گرد گھومنے لگی۔ ساتھ ہی رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہی تھی کہ غنی صحت یاب ہو جائے اور اس کی بیماری ماں کو لگ جائے۔ خدا کی قدرت اگلے دن سے غنی کی حالت بہتر ہونے لگی اور اس کی ماں بیمار پڑ گئی۔ غنی کی زندگی میں وہ منحوس دن بھی آیا جب وہ تو پوری طرح صحت یاب ہو گیا لیکن اس کی ماں اس بیماری میں دنیا سے رخصت ہو گئی۔[۲] ماں کے مرنے پر غنی کی پرورش اس کی دادی کرنے لگی لیکن شاید غنی کی قسمت میں شروع ہی سے حادثے پر حادثہ لکھا ہوا تھا۔ چند ہی سالوں میں دادی بھی وفات پا گئیں۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق غنی کو مسجد بھیج کر اس کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ محلے کے مولوی صاحب سے نماز سیکھنے اور قرآن شریف پڑھنے کے ساتھ ساتھ دینی علوم کے درس کا آغاز ہوا۔ اس وقت ویسے بھی بچوں کا انگریزی سکولوں میں پڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک منظم پروپیگنڈا کچھ اس قسم کا تھا کہ اگر اپنے بچوں کو انگریزی سکولوں میں پڑھنے بھیجا گیا تو ایسے لوگوں کے لیے جنت میں کوئی مقام نہیں بلکہ یہ لوگ سیدھے دوزخ میں جائیں گے[۳]۔ ویسے بھی باچا خان کی انگریزوں کی غلامی سے نفرت نے غالباً انہیں اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ بچے کو اسلامی علوم سے بھی آشنا کیا جائے۔ جلد ہی غنی کو قرآن شریف کے ساتھ ساتھ قرآنی تفاسیر اور احادیث کی کتابوں سے متعارف کرایا گیا۔ ایک دفعہ دیوبند کے ایک عالم آئے اور اتمان زئی

میں آزاد مدرسہ (تفصیل آگے آئے گی) کے طالب علموں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جب ان کی ملاقات بچوں سے کرائی گئی تو اس موقع پر وہیں ایک بچے نے بہت اچھی فصیح و بلیغ عربی میں تقریر کر کے اس عالم کو حیران کر دیا۔ ان کے خیال میں بچے کی مادری زبان عربی تھی لیکن جب ان کے پوچھنے پر انہیں یہ بتایا گیا کہ یہ تو باچا خان کا بڑا بیٹا عبدالغنی ہے تو وہ اس کی عربی زبان کی روانی پر حیرت زدہ رہ گئے[۴]۔

۱۹۲۰ء کے ہجرت کے ناکام تجربے پر باچا خان اور پشتونوں کے لیے دل میں درد رکھنے والے دوسرے ساتھی پشتونوں کی رہنمائی پر کمر بستہ ہو گئے۔ اس وقت پشتون معاشرہ کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ ہزار قسم کی بری عادتیں پشتون قوم نے اپنائی ہوئی تھیں۔ جھوٹی گواہیاں دینا، بات بات پر جھوٹی قسمیں کھانا، مال و جائیداد کی خاطر اپنے ہی بھائی کا خون بہانا، جوا کھیلنا، قتل وڈاکے اور دوسری بہت سی اخلاقی برائیاں ان کے خون میں رچ بس گئی تھیں۔ باچا خان اور ان کے ساتھی اب تک ہندوستان کی سیاسی وسماجی اور مذہبی تحریکوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک خلافت اور ہجرت کے لئے بے حد قربانیاں دیں لیکن ان سب کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کچھ نہ نکلا۔ اسی لئے افغانستان سے واپسی پر ان قوم پرست رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ دوسرے صوبوں کے معاملات پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے لوگوں اور اپنے معاشرہ کی اصلاح پر کیوں نہ توجہ دی جائے۔ ان رہنماؤں میں باچا خان کے ساتھ میاں احمد شاہ، عبدالاکبر خان، میاں جعفر شاہ، محمد اکبر خادم، مولانا محمد اسرائیل اور حاجی شاہنواز بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجہ میں اصلاحی تنظیم ''انجمن الاصلاح الافاغنہ'' کی بنیاد پڑی۔

انجمن اصلاح الافاغنہ یکم اپریل ۱۹۲۱ء کو وجود میں آئی تھی۔ انجمن کے اولین اغراض و مقاصد میں پشتونوں میں باہمی دشمنیاں ختم کرانا، ان میں اتفاق اور بھائی چارہ قائم کرانا، ہر قسم کی معاشرتی اور سماجی

برائیوں کا خاتمہ اور اس کے ساتھ ساتھ پشتو زبان وادب کو فروغ دینا شامل تھا۔اس کے علاوہ انجمن کے فرائض میں وطن عزیز سے محبت اور غلامی سے نفرت بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا شامل تھا۔اس سلسلے میں اپریل ۱۹۲۱ء میں ہی اتمان زئی میں ایک آزاد مدرسہ قائم کیا گیا۔جس کی شاخیں جلد ہی آس پاس کے علاقوں میں پھیل گئیں۔ مدرسے کے نصاب میں قرآن شریف اور حدیث کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فقہ، اسلامی تاریخ، ریاضی، جغرافیہ اور پشتو زبان کی تعلیم شامل تھی۔انجمن کے تعلیم یافتہ اراکین اس مدرسے میں درس وتدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ اساتذہ تدریس کا کام پوری لگن اور جذبے سے کرتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی مدرسے سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ مدرسے کی آمدنی کا بڑا ذریعہ اراکین انجمن سے وصول کیے جانے والے سالانہ چندے تھے جن پر ان مدارس کے اخراجات کا دارومدار تھا[۵]۔باچا خان نے اس مدرسے کو فروغ دینے کے لیے ابتدا اپنے گھر سے کی۔غنی اور ولی دونوں آزاد مدرسے کے اولین طالب علم تھے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ باچا خان نے اپنے دونوں بیٹے آزاد مدرسے میں داخل کرا دیئے ہیں تو ان کے دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اپنے بچوں کو آزاد مدرسہ میں بھیجنا شروع کر دیا۔آزاد مدارس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں طلباء کی تعداد تین سو سے تجاوز کر گئی۔ان دنوں صوبے بھر میں میٹرک کے امتحان لینے کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے بچوں کو میٹرک کا امتحان دینے کے لئے پنجاب یونیورسٹی یعنی لاہور جانا پڑتا تھا۔[۶]

انگریز سامراج باچا خان اور ان کے ساتھیوں کی یہ اصلاحی سرگرمیاں ذرا اچھی نہیں لگتی تھیں۔وہ ان پر ہاتھ ڈالنے کے انتظار میں تھے اور جلد ہی ان کو یہ موقع ہاتھ آ گیا۔صوبائی خلافت کمیٹی کے باہمی اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ کسی کو سربراہ بنانے پر مفاہمت نہیں ہو رہی تھی۔ان میں سے چند لوگ باچا خان کے پاس

آئے اور انہیں دعوت دی کہ وہ پشاور آئیں اور خلافت کمیٹی کی صدارت سنبھالیں۔ اس طرح باچا خان کو خلافت کمیٹی سرحد کا صدر چن لیا گیا۔ انہوں نے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے صوبے بھر کا دورہ کیا۔ باچا خان کا زیادہ زور دیہاتی علاقوں پر تھا۔ وہ صوبے کے دور دراز علاقوں میں بھی جانے لگے اور خلافت کمیٹی کی تشہیر کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں غلامی سے نفرت کا جذبہ بیدار کرنے لگے۔ حکمران زیادہ دیر تک ان کی یہ سرگرمیاں برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے باچا خان کے خلاف ایف سی آر (فرنٹئیر کرائمز ریگولیشن) کے تحت مقدمے درج کیے اور انہیں ۷ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار کر کے تین سال قید بامشقت کی سزا دے دی۔ انہیں مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔[۷]

باچا خان کی گرفتاری کے بعد بھی انجمن کے اراکین نے اپنا کام پوری تندہی کے ساتھ جاری رکھا بلکہ اب تو ان میں قومی جذبہ اور بھی بڑھ گیا۔ انہیں خود تو اس کا احساس پہلے سے تھا اب دوسرے لوگوں کو بھی یہ سمجھانے لگے کہ علم حاصل کیے بغیر ترقی پانا ناممکن ہے۔ اگر جہالت کے اندھیروں میں یوں ہی ڈوبے رہے تو ذلت کی یہ زندگی ساری عمر اسی طرح گذارنا پڑے گی۔ حکومت کا خیال تھا کہ باچا خان کی گرفتاری سے شاید تحریک میں کچھ کمی آ جائے اور پشتونوں کی یہ حب الوطنی جلد ہی ختم ہو جائے لیکن یہ ان کی محض غلط فہمی تھی کیونکہ باچا خان کی گرفتاری پر انجمن کے اراکین اور آزاد مدارس کے اساتذہ اور طلباء نے دن رات محنت کر کے آزاد مدارس کو اور جلا بخشی۔ اتمان زئی کا آزاد مدرسہ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس مدرسے کی شاخیں اور جگہوں میں بھی قائم ہونے لگیں۔ انجمن کے اراکین اور ان مدارس کے اساتذہ کرام اپنے ننھے منے طالب علموں کے ساتھ مختلف علاقوں کا دورہ کرتے جہاں یہ بچے بڑی خوش الحانی سے قومی ترانے اور نظمیں سنا سنا کر لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے۔ یہ سب کچھ پشتونوں کے لیے ایک نیا تجربہ تھا تاہم عام لوگوں میں

آزاد مدارس اور انجمن الاصلاح الافاغنہ کی مقبولیت دن بدن بڑھتی گئی۔ اب انجمن کے اراکین کو اپنا تعارف کرانے کے لیے صرف یہی کہنا کافی تھا کہ ہم انجمن کے اراکین ہیں۔ لوگوں میں ان کے لیے ہمدردی کا جذبہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

غنی اسی زمانے سے ہی سیاست میں داخل ہوگیا۔ باپ کے قید ہوجانے سے بچپن کی شوخیوں اور شرارتوں کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ بچپن ہی سے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑا۔ غنی بھی سکول کے اور بچوں کی طرح ان تمام سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ عبدالخالق خلیق ذکر کرتے ہیں کہ جب لوگوں کے سامنے معصوم غنی باچا خان پر ہونے والے ظلم وستم کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتا تو لوگ زار وقطار رو پڑتے ۸۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ جب باچا خان پہلی دفعہ جیل بھیجے گئے تو ان پر دفعہ ۱۴۰ ایف سی آر کے تحت مقدمہ چلا اور انہیں قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ اس سزا کے تحت انہیں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی پہنائی گئیں۔

باچا خان کیونکہ ایک تندرست اور قدآور شخصیت کے مالک تھے جیل کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں جو کہ ایک عام آدمی کے سائز کی ہوتی ہیں ان کو پوری نہیں آتی تھیں۔ جیل کے حکام نے بیڑیاں زبردستی ان کے پاؤں میں پہنانی چاہیں جو سائز چھوٹا ہونے کے سبب باچا خان کے پاؤں میں نہیں آتی تھیں تو انہوں نے لوہار کو بلوا کر زبردستی وہ بیڑیاں ان کے پاؤں میں پہنا دیں۔ باچا خان کے دونوں پاؤں سے خون بہنے لگا۔ اس وقت اتفاق سے غنی اپنے باپ سے ملاقات کے لیے جیل آیا ہوا تھا۔ اس نے جب باچا خان کو اس حالت میں دیکھا کہ سلاخوں کے پیچھے وہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پہنے زخمی حالت میں گھوم رہے ہیں تو بے اختیار پوچھا کہ بابا پنجرے میں تو لوگ جانوروں اور پرندوں کو بند کرتے ہیں آپ تو انسان ہیں یہ لوگ

آپ کے ساتھ کیوں اس طرح کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ باچا خان کیا بولتے چپ ہی رہے[۹]۔

یہ واقعہ جب غنی اپنی پوری معصومیت کے ساتھ بیان کرتا تو سخت سے سخت دل انسان کا دل بھی باچا خان کے لیے رحم کے جذبات سے بھر جاتا۔ خلیق صاحب یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انجمن کی جانب سے چند اراکین اساتذہ اور طلبا ایک گاؤں کا دورہ کر رہے تھے۔ ایک حجرے میں حجرے کے مالک نے مہمانوں کی عزت واحترام کے لیے تکیے منگوائے اور سب کے پیچھے رکھ دیئے۔ ایک خوبصورت معصوم بچے نے تھوڑی دیر بعد اپنا تکیہ ایک طرف دھکیل دیا۔ حجرے کے مالک نے اس بچے سے پوچھا کہ یہ کیوں؟ بچے نے فوراً جواب دیا کہ اس تکیے کا غلاف ولایتی کپڑے سے بنا ہوا ہے۔ اس کا سہارا لینا میں قومی گناہ سمجھتا ہوں[۱۰]۔ یہ بچہ عبدالغنی تھا۔

۱۹۲۴ء میں باچا خان رہا ہو کر صوبہ واپس آئے۔ جیل کے تلخ تجربے نے انہیں اور بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اب وہ اصلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ پشتونوں کی فلاح و بہبود کے لیے محدود سیاسی سرگرمیوں میں ان کے حصہ لینے کے متعلق بھی سوچتے تھے اور ساتھ ہی قوم کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

۱۹۲۷ء میں جمعیت العلمائے ہند کا سالانہ جلسہ پشاور میں منعقد ہوا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ شاہی مہمان خانے (موجودہ لیڈی گرفتھ سکول) میں جلسے کا انتظام کیا گیا تھا۔ باچا خان کا کیونکہ علمائے دیوبند سے قریبی تعلق تھا اس لیے آزاد مدرسے کے طلباء نے اس جلسے میں بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اس موقع پر غنی نے بھی پشتونوں کی جہالت، علمی پسماندگی، غربت اور لاقانونیت پر مؤثر انداز میں تقریر کی۔ حاضرین جلسہ نے معصوم غنی کی علمی قابلیت اور اس کے موثر انداز گفتگو پر بے حد داد دی[۱۱]۔

غنی نے میٹرک کا امتحان جامعہ ملیہ دہلی سے پاس کیا[۱۲]۔ اس وقت جامعہ ملیہ کا قیام قرول باغ دہلی میں تھا اور ذاکر حسین اس کے پرنسپل تھے۔ غنی کی مزید تعلیم کا ابھی فیصلہ ہو رہا تھا کہ افغانستان میں شورش برپا

ہوگئی۔امیر امان اللہ خان (عہد حکومت ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۹ء) نے افغانستان کو مہذب دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ملک میں جدید اصلاحات نافذ کیں۔ان اصلاحات کی مخالفت میں افغانستان کا ایک خاص طبقہ امیر امان اللہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔اس گڑبڑ میں انگریز سرکار کا بھی ہاتھ تھا جس نے دل کھول کر امان اللہ کے مخالفین کا ساتھ دیا۔امیر کی مخالفت جو لوگ کر رہے تھے ان میں ملا شور بازار بھی پیش پیش تھا۔اس کو امان اللہ کا اصلاحی پروگرام ناپسند تھا۔یہ لوگ انگریزوں کی ایما پر امیر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس پر کفر کے فتوے لگانے لگے۔افغانستان میں جہاں ویسے بھی تعلیم کی کمی تھا عام لوگ ان مولویوں کے ہاتھوں میں آ گئے اور انہوں نے بھی امیر کے خلاف شورش برپا کی۔امیر امان اللہ کو اس کے چند خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ اس بغاوت کو فوراً کچل دینا چاہیے۔امیر امان اللہ خان کسی حالت میں بھی افغانوں کا خون بہانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔انہوں نے فوراً جواب دیا کہ میں اپنے اقتدار کے لیے افغانوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا۔اس اثناء میں حالات مزید خراب ہوگئے۔امان اللہ تخت سے دستبردار ہو کر اور کابل چھوڑ کر قندھار میں رہائش پذیر ہوگئے۔ کابل کے تخت پر بچہ سقا نامی ایک ڈاکو نے قبضہ کرلیا۔

افغانستان کی حالت زار دیکھتے ہوئے سرحد کے پشتونوں نے اس مصیبت کی گھڑی میں ان کی امداد کا فیصلہ کیا۔انجمن کے اراکین اس میں پیش پیش تھے۔باچا خان نے فیصلہ کیا کہ غنی کو بھی اس وقت اپنے پشتون بھائیوں کی امداد کرنی چاہیے۔افغانستان میں امن امان قائم ہو جانے پر غنی دوبارہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کرے گا۔اس موقع پر افغانستان میں ایک طبی وفد بھیجنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔اس وفد میں چھ ڈاکٹر اور ان کی امداد کے لیے ۳۲ طلباء شامل تھے۔وفد کی قیادت باچا خان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب جنہوں نے حال ہی میں سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا، کے سپرد کی گئی۔باچا خان کا یہ خیال تھا کہ غنی پہلے تو طبی وفد

میں شامل ہوکر اس بحران میں افغانوں کی خدمت کرے اور پھر جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، حالات کے سدھرنے پر وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے لوگوں کی خدمت کرے لیکن حالات اس کے برعکس ہوئے۔ حکومت ہند نے طبی وفد کو افغانستان جانے کی اجازت دینے سے انکار کیا۔ ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ امان اللہ خان نے افغانوں سے دل برداشتہ ہوکر ہندوستان کے راستے اٹلی کا رخ کیا اور وہیں مستقل رہائش پذیر اور وہیں وفات پائی۔

باچا خان نے اس کے بعد فیصلہ کیا کہ غنی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر بھیجا جائے۔ ہندوستان کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے۔ قومی کارکنوں پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔ باچا خان کی خواہش تھی کہ غنی کو جرمنی بھیجا جائے جہاں سے ایک تو اپنے آبائی پیشے زراعت کو مدنظر رکھتے ہوئے زراعت میں کوئی ڈگری حاصل کرے اور دوسرے جرمنی کے قیام کے دوران میں وہاں رہتے ہوئے جرمنوں کی ترقی کا راز معلوم کرے اور اس ہنر کو اپنے لوگوں پر آزمائے[۱۳]۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ باچا خان خود بھی مشن ہائی سکول پشاور کے پڑھے ہوئے تھے اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب بھی مشن ہائی سکول پشاور سے پڑھنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تھے۔ جہاں سے انہوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ جرمنی جانے میں کچھ رکاوٹیں تھیں۔ باچا خان نے غنی کو ہدایت کی کہ وہ پہلے انگلستان چلا جائے جہاں غنی کا چچازاد بھائی سعداللہ خان تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ عرصہ رہنے کے بعد موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں جرمنی چلا جائے کیونکہ لندن سے جرمنی جانے کا بندوبست آسانی سے ہوسکتا تھا۔

۲۲ جولائی ۱۹۲۹ء کو غنی نلڈیرا نامی سمندری جہاز میں انگلستان روانہ ہوا۔ اسی سفر کے دوران میں غنی کو شعروشاعری سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس نے کچھ شعر کہے جو اس کی زندگی کی پہلی کوشش تھی۔ لندن جا کر غنی

کے رہنے کا بندوبست ایک پادری کے گھر میں کیا گیا جہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ اکتا گیا۔ غالباً اس کی ایک بڑی وجہ پادری کا وقت بے وقت وعظ و نصیحت کرنا تھا۔ غنی کہتا ہے کہ:

''اس پادری نے اور تو کچھ نہیں سکھایا بس ہر وقت Old Testament اور New Testament کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ سب تو میں یہاں بہت پہلے پڑھ چکا تھا۔ فرق صرف اتنا سا تھا کہ یہاں وہ یوسف تھا اور لندن میں وہ جوزف بن گیا۔ کچھ زیادہ پلے نہیں پڑ رہا تھا''۔[۱۴]

باچا خان ان دنوں وطن عزیز میں بے حد مصروف وقت گذار رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں باچا خان کو کسی نے لندن سے اطلاع دی کہ غنی کی جوانی اور یہاں کا آزاد ماحول اس کے لیے تباہی کا باعث ہو رہا ہے۔ بیٹے کا کچھ بندوبست کرو ورنہ پھر زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ انہی دنوں غنی نے لندن سے اپنے کچھ اشعار ''پښتون'' میں شائع ہونے کے لیے بھیجے جو ''پښتون'' کے جنوری ۱۹۳۰ء کے اشاعت میں شائع ہوئے۔ شعر یہ تھے:

عجیبه دد ځواني عجیبه دد خاني
اے پښتون پوئیے دنشوم په وراني په وداني
داد لا نوے هنر دے چه ورور وژني هغه نردے
فیرنگی ته خوتینګ نه ئے چه ئے غوے کړے پیزواني۔[۱۵]

(عجیب قسم کی تیری جوانی ہے اور عجیب قسم کی تیری خانی ہے۔ اے پشتون تیری بربادی اور آبادی کو کچھ نہیں سمجھ سکا ہوں۔ ایک نیا ہنر سیکھ گئے ہو اور وہ یہ کہ اگر اپنے ہی بھائی کو قتل کرو گے تو بہادر کہلاؤ گے لیکن تیری یہ بہادری کس کام کی جس نے تمہیں فرنگی کے کولہو کا بیل بنا دیا ہے)

تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور عنوان ''اوسنی یاران د خوشی ''(آج کل کے دوست فضول ہیں) کے شعر بھیجے جو''پښتون''ہی میں شائع ہوئے۔ شعر یہ تھے:

نه م یار شته نه به او شی
اوسنی یاران د خوشی
که حاجت ئے در ته وینه
ستا به پلار ږنیکه ہم ښه شی
کارچه ئے خلاص شی داتے تښتی
دلیندے نه لکه غشی۔ [16]

(نہ ہی میرا کوئی دوست ہے اور نہ ہی بنانے کا ارادہ ہے۔ کیونکہ آج کل کے دوست اور ان کی دوستیاں بالکل فضول ہیں۔ اگر تم سے کوئی مطلب پورا کرنا ہے تو تمہارے باپ دادا کی بھی تعریفیں کرے گا اور جب ان کا مطلب پورا ہو جائے تو پھر ایسے بھاگے گا جیسے کمان سے نکلا ہوا تیر)

اپریل ۱۹۳۰ء کے''پښتون''میں پھر''څه کړم''(کیا کروں) کے عنوان کے تحت یہ شعر شائع ہوئے:

چه م باغ د ګلونه نه وي بهار به څه کړم
چه م سترګي دیار نه وي خمار به څه کړم۔ [17]

(اپنا جب پھولوں کا باغ ہی نہ ہو تو بہار کا کیا کروں۔ جب اپنے محبوب کی آنکھوں کی مستی ہی نہیں (جب اپنا محبوب ہی نہ ہو) تو پھر کسی کے آنکھوں کا خمار میرے کس کام کا)۔

لیکن اس کے شائع ہوتے ہی باچا خان نے غنی کو سخت تنبیہہ کی اور کہا کہ ''میں اپنی طرف سے تمہیں یہ ضرور کہوں گا کہ شاعری سے اتنی بھی محبت نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ خادم صاحب (محمد اکبر خادم) کی طرح تمہاری پوری توجہ صرف شاعری ہی پر مرکوز ہو جائے اور باقی سب کام دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ میں نے تمہیں جس کام کے لیے بھیجا ہے کوشش کرو کہ اس کو کامیابی سے سرانجام دے سکو۔ کیونکہ اس میں تمہاری قوم کے لیے تمہارے شعروں سے زیادہ فائدہ ہے۔ اس لیے اپنا وقت فضول ضائع مت کرو''۱۸۔

غنی نے اس کے جواب میں باچا خان کو ایک منظوم خط لکھا جو مندرجہ ذیل ہے:

ستا خطونه تول زما سر ته پرا ته دی

زه ئے لولم هره شپه دوبار دوباره

کله خاندم کله ژاړم لیونے یم

اے زما په بند کښے پروت غریبه پلاره۔[19]

(آپ کے تمام خط میرے سرہانے پر رکھے ہوئے ہیں۔ میں ان کو ہر رات کئی کئی بار پڑھتا رہتا ہوں۔ کبھی ان کو پڑھ کر ہنس پڑتا ہوں اور کبھی رو پڑتا ہوں۔ لگتا ہے کہ دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اے میرے قید و بند میں پڑے ہوئے بے چارے باپ)۔

ادھر وطن عزیز میں فرنگی کے خلاف منظم جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پشتونوں کا علاقہ بھی آزادی کی اس جدوجہد سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہاں بھی حکومت وقت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس کی تفصیلات میں جانے سے پہلے یہ لکھنا ضروری ہے کہ باچا خان نے غنی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی پہلی فرصت میں انگلستان سے امریکہ چلا جائے۔ باچا خان کی ہدایت پر

غنی امریکہ چلا گیا اور وہاں جا کر لویزیانا سٹیٹ یونیورسٹی میں کیمیکل انجنیئرنگ کے شعبہ میں داخلہ لے لیا۔

ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہونے والا تھا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کے اراکین کی تعداد ناکافی تھی۔ کانگریسی لیڈروں نے باچا خان سے درخواست کی کہ فرنگیوں کے خلاف تحریک سول نافرمانی میں وہ کانگریس کا ساتھ دیں۔ انجمن کا سالانہ جلسہ اپریل کی ۱۹ تاریخ (۱۹۳۰ء) کو اتمان زئی میں ہونا قرار پایا تھا۔ وہاں پر خدائی خدمتگاروں کے علاوہ افغان جرگہ کے اراکین اور دوسرے پشتون قوم پرست رہنما بھی موجود تھے۔ پشاور سے کانگریس کے اراکین بھی اتمان زئی گئے اور انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ وہیں انجمن کے سٹیج سے انہوں نے خدائی خدمتگاروں سے اپیل کی کہ آزادی کی جدوجہد میں وہ ان کا ساتھ دیں جو بغیر کسی پس وپیش کے فوراً منظور کر لی گئی۔ ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کے حادثہ فاجعہ میں فرنگی استبداد نے اپنے محکوموں کی جرأت کو برداشت نہ کرتے ہوئے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں نہتے لوگوں پر گولی چلا دی۔ دو سو سے زیادہ لوگ وطن عزیز پر قربان ہو گئے۔ زخمیوں کی تعداد تو اس سے کہیں زیادہ تھی۔ باچا خان اور دوسرے قوم پرست رہنماؤں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ قصہ خوانی (پشاور) کے بعد ٹکر (مردان) اور ہاتھی خیل (بنوں) میں بھی فرنگی بربریت کی داستان دہرائی گئی۔ فائرنگ کے ساتھ ساتھ پشتونوں پر اذیت کے نت نئے طریقے آزمائے جانے لگے لیکن اس سے یہاں کے لوگوں کے حوصلے اور بلند ہوئے۔ جتنا حکومت ان پر ظلم کرتی گئی اتنی ہی قومی رضا کاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ لہذا فرنگی اس تحریک کو دبانے میں ناکام رہے[۲۰]۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ باچا خان اور دوسرے قوم پرست رہنما جیلوں میں ڈالے گئے بہت سوں کی جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ باچا خان کے جیل جانے پر ان کا کارندوں کی بن آئی۔ ولی ابھی چھوٹا تھا اور جائیداد سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ علی بھی ابھی کم سن ہی تھا۔ منشیوں نے یہ سمجھ لیا کہ جائیداد کے مالکان یا تو

جیلوں میں ہیں یا ملک سے باہر ہیں، یہی موقع ہے جتنا ہتھیا سکتے ہو ہتھیا لو۔ باچا خان کے خاندان پر ان کارندوں کے ہاتھوں مالی سختیاں دن بدن بڑھتی گئیں۔ اس کا سب سے زیادہ اثر غنی کی تعلیم پر پڑا۔ غنی کو گھر سے خرچے کی رقم بند ہوگئی۔ غیر ملک میں اس کا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا۔ بہت جلد وہ مجبور ہوگیا کہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ہندوستان واپس آ جائے۔ بڑی مشکلوں سے واپسی کے ٹکٹ کا بندوبست کیا اور یوں غنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر ۱۹۳۴ء میں ہندوستان واپس آ گیا[۲۱]۔

باچا خان ابھی تک جیل میں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ غنی اپنی جائیداد سنبھال لے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خطرہ تھا کہ بقیہ جائیداد بھی کارندوں کے ہتھے چڑھ جائے گی۔ غنی ویسے بھی لاابالی طبعیت کا مالک تھا۔ ابھی چند دنوں پہلے ہی امریکہ سے لوٹ کر آیا تھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ صبح سویرے ہیٹ سر پر پہن کر انگریزی لباس میں ملبوس گھوڑے پر سوار ہو کر ادھر ادھر چکر لگاتا رہتا تھا۔ پشتونوں کی جنگ آزادی کیونکہ فرنگی استعمار کے خلاف تھی انہیں کہاں یہ گوارا تھا کہ غنی انگریزوں کے طور طریقے اپنائے۔ چند خدائی خدمتگاروں نے باچا خان کو جیل میں خطوط بھیجے جن میں ان سب واقعات کی تفصیل بیان کی گئی تھی نیز یہ کہ غنی کا بندوبست کر لو وہ فرنگیوں کے طور طریقے اپنا کر فرنگی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ غنی سے جب پوچھا گیا کہ فرنگیوں کے طرز پر یہ ہیٹ سر پر کیوں پہنتے ہو تو اس نے فوراً جواب دیا کہ:

''میرا اپنا سر ہے، اپنی مرضی سے جو چاہوں اس پر رکھوں گا اس میں کسی اور کا کیا کام؟''[۲۲]

باچا خان نے غنی کو فوراً ہدایت کی کہ یہاں سے الہٰ آباد چلے جاؤ اور نہرو خاندان کے ساتھ کچھ عرصہ گذارو۔ ساتھ ہی باچا خان نے ایک خط جواہر لعل نہرو کو بھی لکھا جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ غنی کو اپنے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے رکھ لو کیونکہ ''وہ امریکہ میں رہ کر امریکن ہوگیا ہے''۔ باچا خان نے نہرو سے

درخواست کی کہ وہ غنی کو دوبارہ یہاں کی تہذیب سکھائے۔غنی نے قریباً ایک سال نہرو خاندان کے ساتھ آنند بھون الہٰ آباد میں گذارا۔ جب کچھ عرصے بعد نہرو کی گرفتاری کی افواہ پھیلی تو اس نے فوراً اپنی بیٹی اندرا اور غنی کو رابندرا ناتھ ٹیگور کے آرٹ سکول ''شانتی نکیتن'' پہنچا دیا۔غنی جب شانتی نکیتن پہنچا تو پہلے پہل اس کا دل وہاں بالکل نہیں لگا۔ وہاں بھی اس کو اپنا گھر، اپنا گھوڑا، اپنی زمینیں اور میلوں بے فکری سے اپنے گھوڑے پر گھومنا یاد آ رہا تھا۔تاہم دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی وہاں اپنا دل لگانا شروع کر دیا۔غنی کو مشہور زمانہ نندلال بوس نے اپنی شاگردی میں لے لیا۔غنی نے اپنی محنت اور خداداد صلاحیت کی بنا پر جلد ہی اپنے استادوں اور شانتی نکیتن کے طلباء میں اپنے لیے ایک خاص مقام پیدا کر لیا[۲۳]۔

غنی نے مصوری اور مجسمہ سازی میں خاص دلچسپی ظاہر کی۔ چند ہی ہفتوں میں اس کے ہاتھ میں صفائی آ گئی اور مہینوں کا کام ہفتوں میں کرنے لگا[۲۴]۔پشتونوں میں مجسمہ سازی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا کیونکہ رجعت پسند مولویوں کو مجسمہ سازی میں بت پرستی کی جھلک نظر آتی تھی لیکن غنی کی طبعیت میں چونکہ آزادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس نے اس قسم کی باتوں کی بالکل پرواہ نہیں کی اور بدستور پوری لگن سے اپنے کام میں لگا رہا۔

۱۹۳۶ء کے اواخر میں باچا خان کو قید سے رہائی ملی تاہم ان پر اپنے صوبے میں داخلے پر پابندی بدستور لگی ہوئی تھی۔ باچا خان نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شانتی نکیتن جانے کا فیصلہ کیا۔ان کا خیال تھا کہ غنی سے ملے کافی عرصہ ہو گیا ہے ایک تو اسے دیکھ لے گا' اس کے پاس کچھ وقت گذار لے گا اور اس کے علاوہ شانتی نکیتن میں غنی کے اساتذہ سے بھی مل لے گا نیز غنی کی تعلیم وغیرہ کی تفصیلات سے آگاہی حاصل کر لے گا۔ وہ جب شانتی نکیتن پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ غنی کی خوبصورتی اور اس کے زیادہ میل جول نے وہاں کی

لڑکیوں میں اس کے لیے ایک خاص مقام پیدا کیا ہے۔ باچا خان کو غنی کا لڑکیوں میں اس طرح گھلنا ملنا بالکل پسند نہیں آیا۔ انہوں نے وہیں فیصلہ کیا کہ غنی کو یہاں مزید نہیں رہنے دیا جائے گا۔ غنی کے اساتذہ کو جب اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے تئیں پوری کوشش کی کہ باچا خان کو اس عمل سے باز رکھا جائے اور ان کی بہت منت سماجت کی اور کہا کہ یہ لڑکا مستقبل میں بہت بڑا آرٹسٹ بنے گا۔ آپ مہربانی کر کے اس کو یہاں رہنے دیں لیکن باچا خان کا ارادہ اٹل تھا۔ انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ بات مہاتما گاندھی تک جا پہنچی۔ ان کو بھی غالباً آرٹسٹ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے لہذا باچا خان اور گاندھی جی دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ غنی کو شانتی نکیتن سے نکالا جائے۔ غنی کے اساتذہ کو انہوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ ''اگر یہ لڑکا برش پر رنگ لگا بھی لے تو اس سے دنیا کو کیا فرق پڑے گا؟''[۲۵]

دراصل باچا خان اور مہاتما گاندھی دونوں چاہتے تھے کہ غنی بھی دوسرے قوم پرست نوجوانوں کی طرح انگریزی استبداد کی مخالفت کرے اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھرپور طریقے سے شامل ہو جائے۔ یہ وقت غنی کی زندگی میں بہت کٹھن تھا۔ ایک طرح کے امتحان کا اس کو سامنا تھا۔ ایک طرف اس کی اپنی خواہشات اور آرزوئیں جن کی وہ تکمیل چاہتا تھا اور دوسری طرف اپنے باپ اور گاندھی جی کا اصرار، اس کا مصوری کا شوق بھی ان دنوں جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ بہت غور وفکر کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی خواہشات کو باپ کی رضامندی پر قربان کر دینا چاہئے۔ غنی نے ارادہ کیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ شانہ بشانہ شامل ہوگا۔ یوں غنی نے مصوری کو خیر باد کہا اور نئی زندگی کی تلخیوں کو قبول کرتے ہوئے سیاسی میدان میں کود پڑا۔ تاہم لگتا ہے کہ یہ سب کچھ غنی نے باپ کی رضا جوئی کی خاطر کیا اور اپنے شوق اور خواہشات کو باپ کی رضامندی پر قربان کر دیا۔

انہی دنوں غنی نے ''نوے لیڈر'' (نیا لیڈر) کے عنوان سے یہ شعر ''پښتون'' میں شائع کرائے:

دقارغه خوله که ژبه دمار که دچرگے عقل زړه دسیارکه

مرئی‌دسپی که چه ښه غپار که ضدد قچر که غرور پر بار که

ختهٔ د کلی ډیران ښار که بیا چرته روند کولال یو یار که

تاله به نوے لیډر تیار که [۲۶]

(کوے جیسا منہ ہو، سانپ کی زبان ہو، مرغی کی عقل اور گیدڑ کا دل ہو، گلا ہو کتے کا جو کہ زور زور سے بھونک سکے، خچر کی ضد ہو، اس پر غرور بار ہو، گاؤں کی مٹی، شہر کے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہو، پھر ایک اندھے ،کمہار کو دوست بنالو، تمہارے لیے وہ، ایک نیا لیڈر بنادے گا)

معلوم نہیں یہ غنی کا سیاست پر طنز تھا یا اس کے دل کی آواز تھی۔ بہر حال اس کی مرضی کے خلاف اس کو سیاست میں لایا گیا۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ غنی نے اپنی رضا کو باپ کی مرضی اور خواہشات پر قربان کر دیا۔

باپ کے کہنے پر نوکری کی تلاش ہوئی۔ گوگا گوگلناتھ شوگر ملز میں تھوڑے عرصے کے لیے ملازمت اختیار کی۔ وہاں زیادہ دل نہیں لگا۔ اپنے علاقے میں واپس آ کر تخت بھائی شوگر مل (مردن) میں ملازمت اختیار کی۔ غنی کی آزاد طبعیت ایک تو ویسے ہی پابندیاں برداشت کرنے کی روادار نہیں تھی قدم قدم پر اعلیٰ افسروں کی روک ٹوک ناگوار ہوئی۔ ویسے بھی چونکہ وہ باچا خان کا بڑا لڑکا تھا اس لئے حکومت وقت کی نظروں میں بھی خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ افسران بالا طرح طرح کے حیلے بہانے تراش کر غنی کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ غنی پر الزام لگایا گیا کہ اس نے مل میں بہت سے خدائی خدمتگاروں کو بھرتی کر لیا

ہے۔غنی کو اس پر غصہ آیا اور افسران بالا کو اس نے دوٹوک لہجے میں صاف صاف کہہ دیا کہ یہ اسی علاقے کے لوگ ہیں۔مردان اور تخت بھائی کے لوگ نوکریاں تلاش کرنے اور کہاں جائیں گے۔ہاں اگر آپ کو یہاں کے لوگوں سے کوئی خاص دشمنی ہے اور ان کے بجائے اگر آپ یہاں مسلم لیگیوں کو بھرتی کرنا چاہتے ہیں تو علی قلی خان کو یا پیر مانکی شریف کو پیغام بھیج دیجئے وہ وہاں سے مسلم لیگی بھیج دیں گے۔یہ اختلافات اس حد تک بڑھے کہ غنی کو نوکری چھوڑنا پڑی۔غنی کے ملازمت چھوڑنے پر مل کے مزدوروں نے بھی استعفیٰ دینا شروع کر دیا۔غنی نے ان کو لاکھ سمجھایا کہ دیکھو میری تو سینکڑوں جریب اراضی ہے اگر اس میں سے میں اپنے لئے دس جریب زمین میں بھی کاشت کروں تو میرا بہت اچھا گذارا ہو جائے گا۔تم لوگوں کا چونکہ اور کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے لہذا یہ قدم مت اٹھاؤ بھوکے مر جاؤ گے۔وہ لوگ نہیں مانے۔غنی اس پر مجبور ہوا کہ ان لوگوں کی بھلائی کے لئے کچھ عرصے تک ملازمت کرے جب یہ سب لوگ دوبارہ اپنے اپنے کاموں پر جانے لگے تو غنی نے پھر چپکے سے کچھ حیلے بہانے کر کے نوکری کو خیر باد کہہ دیا۔[۲۷]

غنی نے کچھ تھوڑا سا عرصہ ہی گھر گذارا تھا کہ اتنے میں مرکزی اسمبلی کے لیے انتخابات کا اعلان ہوا۔صوبائی کانگریس اور خدائی خدمت گاروں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اس بار غنی کو مرکزی اسمبلی میں بھیجا جائے۔اس فیصلے سے بہت سے لوگوں نے تو اتفاق کر لیا مگر عبدالقیوم خان جو کہ پچھلی دفعہ مرکزی اسمبلی میں صوبے سے کانگریس کی نمائندگی کے لیے بھیجا گیا تھا راضی نہیں ہوا۔اس کا خیال تھا کہ پچھلی بار کی طرح شاید اس دفعہ بھی کانگریس اسی کو اپنا نمائندہ بنا کر مرکزی اسمبلی بھیجے گی لیکن کانگریس کے اندرونی حلقوں میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔جب بھی انگریز سرکار کے خلاف کانگریس سول نافرمانی شروع کرتی تو دوسرے کانگریسی اراکین جہاں جیل جانے کے لیے تیار ہوتے وہاں قیوم خان کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اپنے آپ کو جیل جانے سے بچا

لیتا تھا اور اکثر خرابی صحت کا بہانہ کر کے کشمیر چلا جاتا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قیوم خان نے انہی دنوں اپنی کتاب ''گولڈ اینڈ گنز آن دی پٹھان فرنٹیئر'' لکھی تھی۔ اس کتاب کا انتساب اس نے صوبائی کانگریس کا دل جیتنے کے لئے ڈاکٹر خان صاحب کے نام کیا لیکن اب جبکہ کانگریس غنی کو نامزد کر رہی تھی تو قیوم خان نے کانگریس چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور فوراً مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔

غنی کے مقابلے میں صوبے بھر سے خاکسار، مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا نے ایک مشترکہ امیدوار محمد اکبر قریشی کو کھڑا کیا۔ محمد اکبر قریشی ہری پور کے رہنے والے تھے اور ہجرت کے دوران وطن چھوڑ کر افغانستان اور پھر وہاں سے ماسکو چلے گئے تھے۔ وطن واپسی پر ''اسیر فرنگ'' نامی ایک کتاب بھی لکھی۔ مقابلہ زبردست تھا۔ ایک طرف خاکسار، مسلم لیگ اور مہاسبھا کا مشترکہ امیدوار اور دوسری طرف خدائی خدمتگاروں اور صوبائی کانگریس کی جانب سے غنی تھا۔ تاہم غنی نے یہ انتخابات بھاری اکثریت سے جیتے اور کامیاب ہو کر مرکزی اسمبلی میں صوبے کی نمائندگی کرنے پہنچ گیا۔[۲۸]

غنی مرکزی اسمبلی میں ایک نمایاں رکن کی حیثیت سے ابھرا۔ صوبائی حقوق کے تحفظ کے مسئلے پر بحث ومباحثہ کرنا اس کا من پسند موضوع تھا۔ اس کے علاوہ غنی نے پشتون قبائل کے حقوق کی بھی بات کی۔ اس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ جو حقوق اور اصلاحات صوبہ سرحد کو دیئے جا رہے ہیں کیا وجہ ہے کہ آپ ان اصلاحات سے قبائلی علاقوں کو محروم کر رہے ہیں جبکہ یہ ایک لوگ ہیں، ایک ہی زبان بولنے والے اور ایک ہی مذہب کے پیروکار ہیں، ان میں اور حکومت ہند کے زیر سایہ رہنے والے صوبہ سرحد کے لوگوں میں بلا امتیاز ہر قسم کی تفریق کو مٹا دینا چاہئے۔ اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے قبائلی علاقے کے لئے اصلاحات طلب کرنا یقیناً بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی[۲۹]۔ اس لیے کہ ہندوستان بھر میں ان کی شہرت

ڈاکو، قاتل، غاصب اور لٹیروں جیسی تھی۔غنی کو اپنے مقاصد میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ فرنگی حکمران کسی طور سے بھی قبائلی علاقے میں اصلاحات کرنے پر تیار نہیں تھے۔

جنگ عظیم دوم کے خاتمے پر جہاں دنیا نے سکون کا سانس لیا وہاں آئے دن نئی تبدیلیاں ہندوستان کا مقدر بن چکی تھیں۔صوبے میں جنگ کے اختتام پر کانگریسی اراکین کو رہا کر دیا گیا۔انہوں نے رہا ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سردار اورنگ زیب کی مسلم لیگی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرایا جس کے نتیجے میں ڈاکٹر خان صاحب کی دوسری دفعہ وزارت بنی [۳۰]۔

جنگ کی تباہ کاریوں کے پیش نظر یورپی اقوام شاید مزید جنگیں نہیں چاہتی تھیں۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ زبردستی محکوم بنائی ہوئی اقوام کو اب آزادی دے دینی چاہیے۔اس سلسلے میں برطانیہ میں بھی ہندوستان کی آزادی کی باتیں ہونے لگیں۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک پہلے ہی ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔آل انڈیا مسلم لیگ بھی مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ زور وشور سے کر رہی تھی۔ انگلستان میں عام انتخابات ہوئے جس کے نتیجے میں حکومت بدل گئی۔لیبر حکومت نے آتے ہی ہندوستان کے مسئلے کا مستقل حل نکالنے کا فیصلہ کیا۔ برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے ہندوستان میں عام انتخابات کا اعلان کیا۔ ۴۶۔۱۹۴۵ء میں عام انتخابات ہوئے۔ ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ماسوائے صوبہ سرحد مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت کے طور پر ابھری۔تاہم صوبہ سرحد میں نتائج اس کے برعکس نکلے۔ یہاں کی صوبائی اسمبلی کے اراکین کی کل تعداد پچاس تھی۔کانگریس نے پچاس میں سے اکتیس نشستیں حاصل کیں۔اس کی حلیف جمعیت العمائے ہند نے مزید دو نشستیں لیں جبکہ مسلم لیگ صرف 17 حلقوں میں کامیاب رہی۔ [۳۱]

دہلی میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں روزانہ نت نئے فیصلے ہونے لگے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانوی سامراج ہندوستان کو آزادی دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ برطانوی وزیراعظم نے ۱۹۴۶ء کے اوائل میں ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لئے ایک وزارتی مشن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وزارتی مشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچا۔ انہوں نے پہنچتے ہی ہندوستان کی نمائندہ سیاسی جماعتوں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے ہندوستان کے مسئلے کے حل کے لئے تجاویز مانگیں۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ہندوستان کی یہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتیں تو انہوں نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو ہندوستان کی تقسیم کا ایک نیا منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ سرحد کو مسلم اکثریتی صوبوں کے گروپ ''ب'' کے ساتھ ملایا گیا تھا۔ باچا خان اور ان کے ساتھی اس گروپ بندی سے ناخوش تھے کیونکہ بقول ان کے اس گروپ بندی میں انہیں مستقلاً پنجاب کی عملداری میں دے دیا جائے گا[۳۲]۔ فرنگیوں نے بھی ہندوستان سے بخیر و عافیت نکلنے میں اپنے لئے بہتری سمجھی۔ اسی وزارتی منصوبے کے تحت ایک عارضی حکومت بنائی گئی جس کے کرتا دھرتا کانگریسی اراکین تھے۔ مسلم لیگ کی ہائی کمان نے ارادہ کیا کہ اس موقع پر اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے سب کچھ خود کرنا پڑے گا۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو لیگ کی جانب سے ''راست اقدام'' کا دن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ بنگال میں مسلم لیگ کی وزارت تھی۔ وہاں کے وزیراعلیٰ حسین شہید سہروردی نے اس دن عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔ اس دن کلکتہ میں خونریز ہندو مسلم فسادات ہوئے جو وہاں سے پھیل کر بہار، نواکھالی اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں پھیل گئے۔ چند ہی دنوں میں مرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک جا پہنچی۔ وائسرائے لارڈ ویول کو اب اس کا پورا احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں مسلم لیگ کو اعتماد میں لئے بغیر کوئی سیاسی حل نہیں ہو سکتا۔ چند ہی دنوں بعد مسلم لیگ کو بھی عارضی حکومت میں نمائندگی دے دی گئی۔

دہلی میں ہندوستان کے مستقبل کے سیاسی حل کے لئے روزنت نئے منصوبوں کا اعلان ہو رہا تھا۔ اس تمام عرصے میں باچا خان اپنے صوبے سے باہر رہے۔ وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ بہار کے فسادزدہ علاقوں کا دورہ کر رہے تھے۔ ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں میں کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا تھا۔ ویسے بھی صوبائی کانگریس اور خدائی خدمتگاروں کو کانگریس کی مرکزی قیادت پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ ابھی بھی یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کوئی ایسا فیصلہ نہیں مانے گی جس سے قوم پرستوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچ سکے۔ کانگریس ہائی کمان متحدہ ہندوستان پر اڑی ہوئی تھی۔

صوبہ سرحد میں جب مسلم لیگی قیادت نے دیکھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کے ساتھ اسمبلی میں اکثریت بدستور موجود ہے اور کسی بھی طرح انہیں خان وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا تو انہوں نے ایسے طور طریقے اختیار کرنے شروع کر دیئے جن کے ذریعے کسی بھی طرح سے ڈاکٹر خان کی وزارت ختم کرائی جا سکے۔ ویسے بھی لیگ ہائی کمان کے لئے یہ عجیب اور تشویشناک بات تھی کہ مستقبل کے پاکستان کا ایک حصہ بدستور کانگریس کے زیر اثر رہے۔ پنجاب میں بھی مسلم لیگ نے یونینسٹ وزارت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ یہاں بھی ان کو اب ایک ہی طریقہ نظر آ رہا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو کمزور کر کے توڑ دیا جائے۔ ہزارہ سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ جلد ہی تحریک صوبے کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئی۔ تاہم تحریک بڑے شہروں تک ہی محدود رہی کیونکہ دیہی علاقے میں خدائی خدمت گار بدستور چھائے ہوئے تھے اور ان کے خلاف وہاں کوئی تحریک چلانا ممکن نہ تھا۔ مسلم لیگ کی تحریک کو منظم طور پر موثر بنانے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ سے بھی وقتاً فوقتاً لوگ آئے۔ ان لوگوں نے خان وزارت کے خلاف بڑے شہروں میں جلوس نکالے لیکن اس پورے عرصے میں

خدائی خدمتگاروں نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ باچا خان کا عدم تشدد کا فلسفہ ان میں پوری طرح سرایت کر چکا تھا۔ اب انہیں عدم تشدد کو ترک کر دینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم آنے والے دنوں میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ کچھ لوگ اس کے برعکس کام کرنے پر مجبور ہو گئے[۳۳]۔

غنی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ قاضی عطا اللہ اور شاد محمد چند اور خدائی خدمتگاروں کے ساتھ صوابی کے دورے پر نکلے تھے۔ دورے سے واپسی پر جب وہ لوگ مردان سے گزر رہے تھے تو وہاں مسلم لیگ کی رضا کار تنظیم ''غازی پشتون'' کے تقریباً پچاس مسلح اراکین نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ان کی سرپرستی مردان کے فتح محمد خان کا بیٹا کر رہا تھا جو خود بھی اس موقع پر موجود تھا۔ ان میں سے ایک آدمی قاضی عطاء اللہ کی وزارت میں جیل بھیج دیا گیا تھا۔ اس نے قاضی عطا اللہ پر پستول تان لیا اور کہنے لگا کہ آج مجھے موقعہ ملا ہے کہ تم سے اپنا بدلہ لے سکوں۔ بڑی مشکلوں سے عام لوگوں نے اس موقعہ پر مداخلت کر کے ان خدائی خدمت گاروں کو غازی پشتون کے اراکین کے نرغے سے نکالا۔ یہ لوگ جب خدائی خدمت گاروں کے مرکز سردریاب پہنچے تو انہوں نے سارا واقعہ وہاں موجود لوگوں کے گوش گذار کیا۔ غنی اس موقع پر موجود تھا اس نے چند لوگوں سے مشورہ کیا اور فیصلہ ہوا کہ مسلم لیگ کے غازی پشتون کا اگر راستہ یہیں نہ روکا گیا تو آج تو عام لوگوں کی مداخلت پر ان خدائی خدمت گاروں کی جان بچ گئی، کل ممکن ہے اس سے بھی خراب واقعہ رونما ہو جائے اسی لیے بہتر یہی ہے کہ اس کا یہیں سدباب کر دیا جائے۔[۳۴]

۲۴ اپریل ۱۹۴۷ء کو غنی کی سربراہی میں ''خلمے پشتون'' نامی تنظیم بنائی گئی۔ ان لوگوں کا اولین مقصد نہتے خدائی خدمت گاروں کی حفاظت کرنا تھا۔ تنظیم کی اکثریت نوجوان لڑکوں پر مشتمل تھی۔ ان کی وردی کا رنگ سرخ تھا لیکن کالر، کمر بند اور جوتے کالے رنگ کے پہنے جاتے تھے۔ بہت جلد ہی ان اراکین کی تعداد

ساٹھ ہزار سے تجاوز کر گئی۔غنی کے ساتھیوں میں سے امیر نواز خان جلیا نے ان کی بہت مدد کی۔ بعد میں ان لوگوں نے تقسیم ہند کے وقت غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کی۔ یہاں اور بہت سی وجوہات کے علاوہ غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صوبہ بھر میں ہندوستان کے باقی فسادزدہ علاقوں کے برعکس اس دوران بہت کم ہندو مسلم فسادات ہوئے۔غنی سے جب پوچھا گیا کہ خدائی خدمت گاروں کی تحریک کا عدم تشدد سے تشدد کی طرف مائل ہونا کیا اس مقصد کے لئے تھا۔غنی کا جواب یہی تھا کہ انہیں ایسا کرنے پر غازی پشتون نے مجبور کیا۔انہوں نے اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے تو تب ہی ان لوگوں سے عزت محفوظ رہے گی۔اس کے علاوہ اس وقت شاید گالیاں کھانا تو وہ لوگ برداشت بھی کر لیتے لیکن ان کو یہ ڈر ہوا کہ اگر غازی پشتون کو اس موقع پر نہ روکا گیا تو ان کا جارحانہ انداز اور بڑھے گا لہذا اگر انہیں کسی رکاوٹ کے بغیر ایسا کرنے دیا جاتا تو شاید اس صوبے میں تقسیم ہند کے وقت اتنا فساد ہوتا کہ لوگ پنجاب کی خونریزی کو بھول جاتے۔[۳۵]

تقسیم ہند کا فیصلہ بنیادی طور پر ہو چکا تھا۔تین جون ۱۹۴۷ء کو اس میں مزید تبدیلیاں لائی گئیں۔ اس منصوبے کو کانگریس اور مسلم لیگ سمیت ہندوستان کی تقریباً سب سیاسی جماعتوں نے مان لیا۔اس منصوبے کے تحت صوبہ سرحد میں ایک ریفرنڈم (استصواب رائے) کا ہونا بھی قرار پایا۔اس استصواب رائے کے مطابق سرحد کے عوام نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں۔خدائی خدمت گاروں نے حکومت کے اس اقدام کی مخالفت کی کیونکہ بقول ان کے ایک سال پہلے انتخابات میں اس کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہاں کے باشندے پاکستان نہیں چاہتے۔اس کے علاوہ جب ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے صوبائی اراکین اسمبلی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ وہ

پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں۔ تو یہ حق صوبہ سرحد کے صوبائی اسمبلی کے اراکین کو کیوں نہیں دیا جا رہا ہے۔ اگر استصواب رائے کرانا ہی ہے تو اس بات پر ہونا چاہئے کہ صوبہ سرحد کے باشندے پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا اپنے لئے ایک آزاد خودمختار پختونستان میں رہنا چاہتے ہیں۔ حکمرانوں کو اس موقع پر ایسے مطالبات بالکل پسند نہیں آئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کانگریس نے بھی تقسیم ہند کو مان کر خدائی خدمت گاروں کو بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا کیونکہ اب تک تو وہ بار بار خدائی خدمت گاروں کو یہ یقین دہانی کراتے رہے کہ کسی بھی حالت میں کانگریس ہندوستان کی تقسیم پر راضی نہیں ہوگی لیکن اب جب کہ پانی سر سے گزر چکا تھا خدائی خدمتگاروں اور باچا خان کو احساس ہوا کہ ان کے اپنے ہی دوستوں اور ساتھیوں نے ان سے بے وفائی کی کیونکہ انہوں نے ابھی تک صوبہ سرحد کے قوم پرستوں کو اس دھوکے میں رکھا تھا کہ کانگریس کسی بھی طور پر ہند کی تقسیم پر راضی نہیں ہوگی۔ باچا خان کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ کانگریس اپنے حلیفوں سے مشورہ کئے بغیر کیوں اتنی بڑی بات پر راضی ہوگئی اور پھر سونے پر سہاگہ کہ نہ تو باچا خان سے کوئی مشورہ کیا گیا اور نہ ہی ڈاکٹر خان صاحب کو اس معاملے کی کوئی اطلاع دی گئی۔ خان برادران کو صرف بتا دیا گیا کہ کانگریس بنیادی طور پر تقسیم ہند پر راضی ہوگئی ہے۔ ۳۶

شاید اگر کچھ عرصہ پہلے کانگریس رہنما پشتون قوم پرستوں کو یہ سب کچھ بتا دیتے تو ان کے لئے کافی وقت ہوتا کہ وہ اپنے مستقبل کے لئے قائداعظم اور مسلم لیگ سے کوئی باعزت سمجھوتہ کر لیتے۔ اب جبکہ تمام تفصیلات طے ہو چکی تھیں تو خدائی خدمتگاروں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ استصواب رائے میں حصہ نہ لیں۔ باچا خان نے اس موقع پر کانگریس سے صرف یہ گلہ کیا کہ ہم لوگوں نے تو سترہ سال تک ہندوستان کی جنگ آزادی میں تم لوگوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ پشتونوں کی قربانیاں باقی ہندوستان سے یقیناً کسی

بھی طور پر کم نہیں ہیں لیکن اب جب کہ ان قربانیوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت آیا تو آپ لوگوں نے ہمیں بیچ منجدھار میں ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا۔ کانگریس کا اپنا مقصد پورا ہو چکا تھا انہوں نے باچا خان کے ان گلے شکووں پر کوئی کان نہیں دھرا۔ خدائی خدمتگاروں نے اس ریفرنڈم کا بائیکاٹ کیا تو مسلم لیگ نے بغیر کسی رکاوٹ کے یہ استصواب رائے جیت لیا اور یوں صوبہ سرحد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا حصہ بن گیا۔ ۳۷

تقسیم کے دنوں میں غنی ہندوستان میں تھا۔ اس کو گاندھی جی نے یہ مشورہ دیا کہ ان حالات میں تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ کچھ عرصہ یہیں ٹھہر جاؤ۔ غنی اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ جہاں اور سارا خاندان ہے ان پر جو مصیبت آنی ہے میرے پر بھی آنے دو۔ ہندوستان میں اکیلے رہتے ہوئے اس کو بالکل قرار نہیں تھا۔ دو تین مہینے ہندوستان میں گذارنے کے بعد وہ پاکستان چلا آیا۔ یہاں اس کی توقعات کے برعکس صوبے میں قیوم خان کی وزارت تھی۔ اس نے خدائی خدمتگاروں کو ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

مرکزی اسمبلی کے اجلاسوں کے دوران لیاقت علی خان سے رسم وراہ پیدا ہو چکی تھی۔ نوزائیدہ مملکت پاکستان میں لیاقت علی خان ایک مضبوط شخصیت کے طور پر ابھرے۔ انہوں نے غنی سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور اس کو کہا کہ کسی طریقے سے باچا خان سے یہ چند سطور لکھوا لو اور مجھے دے دو کہ خدائی خدمتگار پاکستان کے وفادار رہیں گے۔ اس کے بعد قیوم خان کسی طور پر بھی ان پر ظلم وستم نہیں کر سکے گا۔ باچا خان کسی طور پر بھی اس کے لئے راضی نہیں ہو رہے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ ان کے سیاسی مخالفین کاغذ کے اس پرزے کو کہیں ان کے خلاف نہ استعمال کریں۔ آخر غنی کے بے حد اصرار پر انہیں غنی کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ غنی نے باپ کو یاد دلایا کہ کراچی میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں جب باچا خان نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھا لیا ہے تو پھر ان کو یہ چند سطور لکھنے میں کیا ہچکچاہٹ ہے۔ خیر باچا خان نے یہ چند سطور لکھ دیں تاہم

قاضی عطااللہ جو اس موقعہ پر موجود تھے، انہوں نے وہ خط باچا خان کے ہاتھوں سے لے کر یہ کہتے ہوئے اپنی جیب میں ڈال دیا کہ غنی ناتجربہ کار ہے ایسا نہ ہو کہ کہیں مسلم لیگی ہمارے ساتھ کوئی فریب کریں اور باچا خان کی ان چند سطور کو ہمارے خلاف استعمال کریں۔ وہ اس پر اصرار کر رہے تھے کہ جب باچا خان یہ لکھ کر دے رہے ہیں تو ہمیں اس کے بدلے میں حکومت پاکستان سے کیا ملے گا۔ یہ بھی پہلے سے طے ہو جانا چاہئے۔ غنی اس پر ناراض بھی ہوا لیکن اس کی ایک نہ چلی اور اس کو قاضی عطااللہ کے ہمراہ لاہور آنا ہی پڑا۔ جب یہ لوگ لاہور پہنچے تو ان کو پتہ چلا کہ وزیراعظم پاکستان پر دل کا دورہ پڑا ہے اور اس وقت وہ ہسپتال میں ہیں۔ جب یہ لوگ ہسپتال پہنچے تو وہاں ان کو پتہ چلا کہ لیاقت علی خان سے ملنے کی اجازت نہیں۔ تاہم جب غنی نے پیغام بھیجا تو لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی نے فوراً انہیں اندر بلوایا۔ غنی کے بقول لیاقت کے بولنے پر پابندی تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے وہ کاغذ جس پر باچا خان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر تھی وہ مانگی۔ غنی نے قاضی عطااللہ کی طرف دیکھا۔ قاضی عطااللہ نے لیاقت علی خان سے بحث کرنی چاہی کہ اس کے بدلے میں ان کو کیا ملے گا۔ لیاقت علی خان نے غنی پر ناراضگی سے بھرپور ایک نگاہ ڈالی اور کوئی جواب دیئے بغیر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ دونوں ناکام ہسپتال سے واپس لوٹے۔[۳۸] لیاقت علی خان سے اس موضوع پر غنی کی اور کوئی بات نہیں ہو سکی کیونکہ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی ان کو راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ قیوم خان نے وزارت اعلیٰ کا منصب سنبھالتے ہی خدائی خدمتگاروں پر ظلم وستم کا ایک بازار گرم کر دیا۔ ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو باچا خان کو گرفتار کیا گیا اور اس کے فوراً بعد خدائی خدمتگاروں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ جماعت کو خلاف قانون قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی۔ تقریباً سب سرکردہ خدائی خدمت گاروں کو مختلف الزامات میں جیل بھیج دیا گیا۔[۳۹] ۴ جولائی ۱۹۴۸ء کو غنی کو بھی گرفتار کیا گیا۔

پورے چھ سال تک پاکستان کی مختلف جیلوں میں رہنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں جیل سے رہائی ملی۔[۴۰]

اس کے بعد کی زندگی کا اکثر حصہ اپنے آبائی گاؤں میں ہی گذارا۔ جیسے کہ لکھا جا چکا ہے کہ سیاست غنی کو راس نہیں آئی۔ اس لئے باقی زندگی سیاست سے دور رہنے کا فیصلہ کیا اور شعروادب میں ڈوبے رہے۔ غنی نے ۸۲ سال کی عمر میں ۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء کو وفات پائی۔ ان کی اہلیہ روشن غنی اور اکلوتا بیٹا فریدون غنی ان کے انتقال سے چند سال پہلے وفات پا چکے تھے۔

غنی کی تصانیف

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ غنی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے نہ صرف انقلابی شاعر کی حیثیت سے اپنا نام پیدا کیا بلکہ پشتو شعروادب کے بہت سے میدانوں میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ذیل میں غنی کی تصنیفات کا ایک مختصر سا تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

دپنجرے چغار (پنجرے میں فریاد/پنجرے کی فریاد)

یہ غنی کے منظوم کلام کا پہلا طبع شدہ حصہ ہے۔ غنی نے اس مجموعے کے اکثر اشعار اپنے جیل کے ایام میں لکھے۔ کتاب کے اختتامیہ میں لکھتے ہیں کہ ''آج ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو ہری پور میں جیل میں یہ کتاب ختم کی۔'' **دپنجرے چغار** جو کہ ۲۱۵ اشعار کے مجموعوں پر مشتمل ہے، پشاور ہی کے ایک ناشر یونیورسٹی بک ایجنسی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کی۔ کتاب کا پیش لفظ پشتو کے مشہور ادیب ماسٹر عبدالکریم کا لکھا ہوا ہے۔

دغنی پلوشے (غنی کے پلوشے)

یہ غنی کے منظوم کلام کا دوسرا بڑا مجموعہ ہے جو کہ کابل کی پشتو اکیڈمی کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی ضخامت ۲۳۶ صفحات کی ہے۔ شروع کے ۱۲۳ صفحات پر غنی کا نیا کلام چھاپا گیا ہے اور بقیہ کتاب ان کے **دپنجرے چغار** سے لیے گئے اشعار پر مشتمل ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں جو کہ گل باچا الفت کا لکھا ہوا

ہے غنی کی ایک یادداشت کا ذکر ہوا ہے جو کہ غنی نے خود لکھی تھی اور لکھنے کی تاریخ ۲۰ جولائی ۱۹۴۹ء بیان کی گئی ہے۔ غنی اس میں کچھ یوں مخاطب ہے:

''کتاب تو ختم ہوگئی ہے لیکن ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ خیر پھر کہیں کوئی بندوبست کرلیں گے۔ زندگی بھی کیا عجیب چیز ہے۔ اس کتاب میں دیا ہوا پہلا شعر بحر ہند میں ایک بحری جہاز میں کہا ہوا ہے اور آخری شعر ہری پور جیل کے اندر کوارنٹین کی چکی میں۔ اس دوران مجھ پر مستی، خوشحالی، غم، ارمان، امید، ڈر، مسکراہٹ اور رونے کی کیفیتیں گذر چکی ہیں۔ یہ سب کچھ اس کتاب میں تو دیا گیا ہے لیکن افسوس صرف اس کا ہے کہ زبان دل جتنی طاقت نہیں رکھتی۔ بیان احساس سے زیادہ کمزور ہے لیکن پھر بھی جو کچھ ہے سب کے سامنے ہے کیونکہ میں نے کبھی کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی جو گذری سب بیان کردی۔ یہ میری اپنی تصویر اپنا عکس ہے۔ بہت نامکمل، ادھوری، لیکن میں بہانگ دہل کم از کم یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ اس میں جو کچھ بھی دیا ہوا ہے میری اپنی ملکیت ہے۔ یہ میری بے مطلب اور فضول زندگی کی طرف سے ایک بے قیمت سا تحفہ ہے جو کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے ملک اور قوم کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ کاش اس میں فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیتا لیکن میں کیا کروں یہی میری استطاعت ہے اور بندہ اپنی استطاعت کے مطابق ہی کچھ کرسکتا ہے۔ اگر ان خیالات میں اتنا حسن ہوا کہ میرے بعد بھی زندہ رہ سکے تو پھر میں یقیناً یہ دعویٰ کرسکوں گا کہ میں نے آب حیات کا چشمہ پالیا ہے۔ ابھی میں نے ان کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور پھر یہ مجھے زندگی بخشیں گے'' (غنی)

پانوس (فانوس)

فانوس غنی کے منظوم کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۷۸ء میں قومی مکتبہ پشاور کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ کل ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غنی کے نئے کلام کے علاوہ **''پلوشے''** اور **''دپنجرے چغار''** سے بھی کچھ منتخبات لیے گئے ہیں۔

دغنی لیکونه (غنی کے خطوط)

غنی نے اپنی ادبی اور سیاسی زندگی میں بے شمار لوگوں کو خطوط لکھے۔ ان میں اردو، پشتو اور انگریزی زبان کے لکھے ہوئے وہ خطوط بھی شامل ہیں جو مختلف اوقات میں مختلف کتب، رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں تاہم ان کو ابھی تک کتابی شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا ہے۔

دغنی کلیات (کلیات غنی)

غنی کی کلیات جو کہ ان کے ''دپنجرے چغار''، ''پلوشے'' اور ''پانوس'' میں لکھے گئے اشعار کے علاوہ ان کے نئے اشعار پر بھی مشتمل ہے افغانستان سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ ''کلیات'' کی کل ضخامت ۶۸۰ صفحات ہے اور پشتو زبان کے ایک اور شاعر سلیمان لائق نے اس کا پیش لفظ لکھا ہے۔

The Pathans--A Sketch (دی پٹھانز۔۔اے سکیچ)

انگریزی زبان میں غنی خان کی لکھی ہوئی واحد کتاب یونیورسٹی بک ایجنسی، پشاور نے شائع کی ہے۔ کتاب پر اشاعت کا سال موجود نہیں۔ اس کتاب میں غنی نے پشتونوں کو متعارف کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس نے پشتونوں کی تاریخ وسیاست، تہذیب وتمدن اور عادات واطوار کے ساتھ ساتھ ان میں موجود توہمات وغیرہ کا بھی مختصر جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ غنی نے ان کی جدوجہد اور خواہشات، ان کی محبتوں اور نفرتوں اور ان کے کھیتوں اور برجوں کا بھی تعارف کرایا ہے۔ غنی نے اس کے علاوہ پشتونوں کی روایتی زبان ان کے اپنے منہ سے اس کی ''نئی بندوق اور پرانی بیوی'' کے ذریعے تعریف کرائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے سخت اور مضبوط بدن لیکن اس میں ایک نرم اور شفیق دل کے متعلق بتایا ہے۔ بہت سے لوگوں کی رائے میں غنی کی ۵۷ صفحات پر مشتمل یہ مختصر کتاب اپنے ایک اور ہم عصر سر اولف کیرو کی ضخیم کتاب "The Pathans" پر بھاری ہے۔

دغنی لټون (غنی کی تلاش)

غنی کی پشتو زبان میں لکھی ہوئی ایک اور کتاب ہے جو کہ ۱۹۹۵ء میں فرنٹیئر پوسٹ پبلیکیشنز پشاور نے شائع کی ہے۔ اگرچہ اس میں غنی کے کچھ نئے اشعار بھی شامل ہیں لیکن کتاب کا بیشتر حصہ غنی کی پہلی شائع شدہ کتب ''دغنی پلوشے'' ، ''دپنجرے چغار'' ''پانوس'' اور ''دغنی کلیات'' پر مشتمل ہے۔

متفرقات

ذیل میں غنی کی چند غزلوں، نظموں اور اشعار کو ان کے اردو ترجمہ سمیت دیا گیا ہے۔

دعا

ستر گو د جانان کښے ښکلی جهانو نه دی

وا د خلمه د نیا زه و پو ے ستا د دینا نه یم

(میرے محبوب کی آنکھوں میں خوبصورت جہاں موجود ہیں۔ اپنی دنیا اگر واپس لینی ہے تو لے لو میں تمہاری اس دنیا کا بھوکا نہیں ہوں)

گوره دفقیر کچکول کښے تاج د سکندر دے پروت

زه یم د سخیا نود شو ماڼو گدا نه یم

(دیکھو تو ایک فقیر کے کشکول میں سکندر کا تاج کیسے پڑا ہوا ہے۔ میں سخیوں میں ہوں کنجوس کا خواست گار نہیں ہوں)

زه ئے په غرور در نه دمینے په نوم غوا ړم

زه ملنگ بے نیازه ستا د ویر وا ویلا نه یم

(میں تو تم سے بڑے غرور سے محبت کے نام پر مانگتا ہوں۔ میں ایک بے نیاز ملنگ تمہارے آگے

رونا دھونا نہیں کروں گا)

یو دسپوږمئے څاڅکے درنه تیک له دیار غواړمه

زه یم د خوبونو د لالونو ګدا نه یم

(تم سے صرف چاند کا ایک قطرہ اپنے محبوب کی پیشانی پر سجانے کے لیے مانگ رہا ہوں۔ میں تو حسن اور خوبصورتی مانگتا ہوں سیم وزر کا گدا نہیں ہوں)

هغه مستی غواړم چه ئے مرګ نه شی وژلے

زه دِ د غمونو د هیګا او سبا نه یمه

(میں تو وہ مستی مانگتا ہوں جسے موت بھی نہ مار سکے۔ میں تو صبح وشام غموں میں رہنے والی زندگی کا سوال نہیں کر رہا)

او تنشه دنیا ګئے که دِ بخښے نو اے امیره!

ستا شوه ستا دنیا۔ زه وږے ستا دنیا نه یم

(اور اگر پھر بھی اپنی یہ چھوٹی سی دنیا بخشنا چاہتے تو اے مالک سن لو۔ تمہاری یہ دنیا تمہیں مبارک میں تمہاری اس دنیا کا بھوکا نہیں (کلیات غنی ص:۳)

غزل

هله یا روته نزدے شوم چه دیاره شومه لرے

هله پوئے شوم په خبرو چه ئے نه اورم خبرے

(اپنے محبوب کی قربت جب ہی ملی جب محبوب سے دوری ہوئی۔ تب اس کی باتوں کی سمجھ آنے لگی جب اس کی باتیں مزید سنائی نہ دینے لگیں)

چه ملنګ شومه جانانه خزانه م ومنتله

چه زړګی کښے مِ پرتے وے بنکلے بنکلے ملغرے

(جب سب کچھ چھوڑ کر ملنگ بنا تب ہی ایک خزانہ پایا۔ تب ہی جا کر نظر آنے لگا کہ میرے دل میں تو حسین اور خوبصورت لعل و جواہر موجود ہیں)

چه مِ ګل بستان قربان که نود ګل بستان مالك شوم

چل م هله د پرزده که چه مِ وسولے وزرے

(جب میں نے اپنے پھولوں اور گلستان کی قربانی دی تب ہی جا کر ایک اور گل اور گلستان کا مالک بنا۔ مجھے اڑنے کا طریقہ تب ہی جا کر کہیں آیا جب اپنے پر اسی کوشش میں جلا دیے)

چه په جام کښے د ساقی م دخوانئے وینه کړه ګډه

هله پورته شو محفل کښے دخمار خمار بڅرے

(جب ساقی کے جام میں اپنی جوانی کا لہو ملایا تب کہیں جا کر محفل یاران میں خمار سے بھری ہوئی چنگاریاں نظر آنے لگیں)

چه په شوق او په مستئی م دواړه سترګے ورلوګے کړے

هله هله راته و کړے دساقی سترګو خبرے

(جب شوق اور مستی میں آ کر اپنی دونوں آنکھوں کو سلگایا تب کہیں جا کر پھر ساقی کی آنکھوں نے مستی بھرا پیغام دیا)

چه پرے مسته خوانی داؤکړے چه پرے بنکلے سرکړي خاؤرے

دھغوئی دی لیونیہ -- دجانان شونڈے شکرے

(جو اپنی مست جوانی داؤ پر لگا سکے اور جو اپنے سر کا سودا کر سکے تو اے دیوانے یقیناً محبوب کے رسیلے ہونٹ ان کے ہی ہیں)(حیدر آباد جیل)(کلیات ص:۲۲)

قسمت

چہ څوک سوال د پلاؤ و کړی ور کړے دال

اکثر خور کړے پہ ښکاری د ښکاری جال

(جب کوئی پلاؤ کی خواہش کرتا ہے تو اس کو دال دیتے ہو۔ اکثر شکاری کو اپنے جال میں خود ہی جکڑ دیتے ہو)

چاتہ جام کښے د سرو خاؤرے شگے واچئے

چالہ ور کړے دایرو پہ ډھیر کښے لال

(کسی کے سونے سے بنے ہوئے جام میں مٹی اور ریت ڈال دیتے ہو اور کسی کو راکھ کے ڈھیر میں ہیرے اور جواہر بخش دیتے ہو)

یو وبال چہ څوک پہ صبر صبر تیر کړی

ورلہ راولے دھغے لوئے وبال

(اگر کوئی ایک وبال صبر کے ساتھ سہہ جاتا ہے تو اس کو پھر اس سے بڑا وبال دے دیتے ہو)

څومره بار چہ څوک وړی دومره وارچے

ذ زمری خطرے نہ تیری شغال

(جو جتنا بوجھ اٹھا سکے اتنا ہی اس پر ڈال دیتے ہو۔ جیسے کہ شیر کے خطرے سے گیدڑ گذر چکا ہو)

چه کوم کال خلق زاری دباران وکړی

په باران پسې رانده کړې هغه کال

(جس سال لوگ بارش کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ان کی آنکھیں اس سال بارش کے لیے ترس جاتی ہیں)

لیونی نه خفه مه شې درقربان شم

اکثر ورداغې دخرپه ځائې کولال

(تیرے قربان جاؤں دیوانے سے ناراض مت ہو جانا۔لیکن اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ جانور کی جگہ اس کا مالک داغا جاتا ہے)(حیدرآباد جیل)(کلیات ص:۲۳)

توقه (مزاق)

ما به شمع شمع کوله	میں ہمیشہ شمع شمع کرتا رہا
تا که جوړ رانه پتنګ	اور آپ نے مجھے پتنگ بنادیا
تلمه ښکارله دکبورو	میں تو مچھلیوں کا شکار کر رہا تھا
تاور پیښ کړم په نهنګ	آپ نے مجھے مگر مچھ کے سامنے کر دیا
ماد قصته وې ملنګ یم	میں تو ویسے ہی (مذاقاً) کہتا تھا کہ ملنگ ہوں
تار ښتیا کړمه ملنګ	آپ نے تو مجھے سچ مچ کا ملنگ بنادیا
ما پیښې کړې دتور زنو	میں تو ویسے ہی بہادروں کی نقل کر رہا تھا
تام کورله راوړو جنګ	اور آپ جنگ کو میرے گھر لے آئے
زه خوغږ کولې نه شم	میں تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتا
په ګیلوته خفه کیږې	کیوں کہ گلوں شکووں سے آپ ناراض ہوتے ہیں

خوحقه داده لویه خدایه	ورنہ سچی بات تو یہ ہے اے میرے عظیم خدا
ته په **تو** قونه پوهیږے	آپ مذاق بھی نہیں سمجھتے

(حیدرآباد جیل۔کلیات ص:۳۱)

مرګے (موت)

مرګے دِراشی	موت کو آنے دو
چه کله ئے وس وی	جب اس کا جی چاہے
گل به رم لاس کښے وی	میرے ہاتھ میں تو یا پھول ہوگا
اویا به اَس وی	اور یا گھوڑے پر سوار ہوں گا
یا به **توپک** وی	یا ہاتھ میں بندوق ہوگی
یا به **قلم** وی	یا پھر ہاتھ میں قلم ہوگا
دوب په خندا کښے	ہنسی میں ڈوبا ہوا
دَ دنیا غم وی	دنیا کا غم ہے
چه **څه** موبخت وی	جو قسمت میں لکھا ہے
دومره به بس وی	شاید وہی کافی ہے
مرګے دِراشی	موت کو آنے دو
چه کله ئے وس وی	جب اس کا جی چاہے
ولے آخر **سړے ستړے** شی ـ اودا اومنی چه	(لیکن آخر انسان تھک جاتا ہے اور پھر اس کو ماننا ہی پڑتا ہے کہ

جام کښے گوټ گوټ	جب جام میں قطرہ قطرہ
شراب کمیږی	شراب کم ہوتی جارہی ہے
سپرلے خلا صیږی	موسم بہار رخصت ہوا چاہتا ہے
گلاب کمیږی	گلاب آہستہ آہستہ کم پڑ رہے ہیں
رڼاڼ شمع کښے	شمع کی روشنی میں بھی
دسحرنور راغے	صبح کی سپیدی چھا سی جاتی ہے
کور د بلبلو ته	بلبلوں کے گھونسلوں میں
نوم دباتور راغے	باتور کا نام آ گیا ہے
ستار کښے شرنگ هغه	ستار میں وہی جھنکار
دمابنام نشته دے	شام والی اب کہاں
سروور په ستر گو کښے	اب آنکھوں میں خیام کے
دخیام نشته دے	وہ سرور کہاں رہا)

(دښکلے نه ښکلے، دمست نه مست، دسور نه سور، گل آخر خپلے حیرانے اوغمجنے ستر گے دخزاں یخواو بے رحمو بادو ته پور ته کړے او دَخپل ژوند د شروع او خلا صیدو تیوس تروکړی۔ اودغے ته وایو مونږ فلسفه)

(حسین سے حسین، مست سے مست، سرخ سے سرخ پھول نے بھی آخر کار اپنے غم سے بھرپور آنکھیں خزاں کی سرد و بے رحم ہواؤں کی طرف اٹھائیں اور ان سے اپنی زندگی کی ابتداء اور ختم ہونے کا راز

پوچھا۔اسی کو ہم کہتے ہیں فلسفہ)

زه مرگ یوه ورځے په مخه کړم او د خپلے مور د سینے نه ئے دخا ورو هغه ډیری له بوتلم کوم ځائے چه په یودشت او بیابان کښے د هغے هډوکی پراته وو۔ ماچارچا پیره او کتل۔ ستغ درب سره خاوره اوشنه کانی وو۔ دلته نه د ګلونو چمن وو نسه دبلبلو باغ دے۔ دبدرنګئی په سمندر کښے د حُسن یوه قطره هم نه وه۔ زهٔ د خاوړے دیوډیری په خوا کښے او دریدم یوه ماته شنه خازه و ه شل دیرش کانی ښکته پراته وو۔ نورے تولے اوچے تږے وږے خاوړے وے۔ مرګ هم راورسید و۔ اوشاته م دَ آسمان اوچت ولاړ وو۔ خوماسر اوچت که اودَمرګ خالق ته م اووے:

(ایک دفعہ مجھے موت لے گئی اپنے ساتھ اپنی ماں کے سینے سے اٹھا کر اس مٹی کے ڈھیر تک پہنچادیا جہاں ایک دشت و بیابان میں اب صرف اس کی ہڈیاں ہی رہ گئی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔جنگلی گھاس، سرخ مٹی اور پتھروں کا ایک ڈھیر، یہاں نہ تو پھولوں کا گلستان تھا اور نہ ہی وہ باغ جہاں ہر وقت بلبلیں چہچہایا کرتی ہیں۔اس بدصورتی کے سمندر میں حسن کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں مٹی کے ایک ڈھیر کے قریب کھڑا ہو گیا۔ایک ٹوٹی ہوئی پتھر کی سل اور تیس چالیس پتھر زمین پر بے ترتیب بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ باقی ہر طرف پیاسی سوکھی مٹی ہی مٹی تھی۔موت بھی چپکے سے آ کر ساتھ کھڑی ہوئی۔وہ میری پشت پر کھڑی تھی اور آسمان تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن میں نے اپنا سر اٹھایا اور موت کے خالق سے کہنے لگا:)

زه د هغے لال زه د هغے دستر ګو تور ومه

زه به د هغے په سینه تل اوده نسکور ژومه

اوس ئے ښکته ښکته دمزار کا ټوټه ګورمه
خاورو کښے پرته ده چه ئے زه دَزړه هلال وَمه
هغه لال شو خاورے چه ئے زه وړوکے لال وَمه

لاړمه اسمان ته ماوے اے دجهان مورسپوږمئے
زور دَمرګی زیات دے که دے زیات دمینے زورسپوږمئے
اوری په لحد کښے څوك دَسوی زړګی شور سپوږمئے

موتیے خاوړے څنګه ہټ دَحُسن یو جهان کړی
یوہو کے دَباد دا چمن څنګه بیابان کړی
خوله مِ نه جوړیږی چه ظالم او وایم رحمان ته
خومرګ چه دجهان بادشاه کړم څه ووایم ځان ته
ولے دروازه دَعلم لړنه شوه انسان ته

سیال ئے دځان ولے کړم چه زه دخاورو سیال ومه
هغه لال مِ څه شو چه زه ئے وړوکے لال ومه

(میں اس کا لعل تھا اس کی آنکھوں کا سرور تھا
میں ہر وقت اس کے سینے پر پڑا رہتا تھا
اب نیچے اس کے مزار کے پتھروں کو بار بار دیکھتا ہوں
مٹی میں وہ موجود ہے جس کے لئے میں اس کا ہلال تھا

وہ لعل آج مٹی میں مٹ گئی جس کا میں ایک چھوٹا سا لعل تھا)

میں وہاں سے چل کر آسمانوں کی طرف گیا اور پوچھنے لگا کہ اے جہاں کی ماں چاندنی ذرا بتا تو سہی کہ موت کا زور زیادہ ہے یا محبت کی طاقت زیادہ ہے شاید (اس وقت بھی) کوئی لحد میں لیٹے ہوئے اس جلتے ہوئے دل کی فریاد سن رہا ہو۔ کیسے ایک مٹھی بھر مٹی ایک حسن کا جہان اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ ایک پھونک ہوا کی کس طرح ایک لہلہاتے ہوئے چمن کو بیابان بنا دیتی ہے۔

کس منہ سے رحمٰن کو ظالم کہوں

لیکن جب موت کو جہاں پر راج کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو پتہ نہیں اپنے آپ کو پھر کیا کہوں

لیکن علم کا یہ دروازہ کبھی بھی تو انسان کے لیے نہیں کھلا

اپنے برابر اس کو کیوں بناؤں جب کہ اس نے مجھے مٹی کے برابر بنایا

وہ لعل پتہ نہیں کہاں گیا جس کے لیے میں ایک چھوٹا سا لعل تھا)

خو دژوند خائیثت دادے چہ ټول عمر انسان سرہ دغہ دختلاصیدو فکر نہ وی کلہ کلہ ئے دا ټولے غټے هیرے شی اوخپل ماحول کښے د وړو وړو څیزونو پہ تماشہ شی او دو ړو شمعو پہ تالاش کښے ځان دغے لوئے تاریکی نہ اوتښتوی۔

(لیکن زندگی کا اصل حسن ہی یہی ہے کہ تمام عمر انسان کے ساتھ اس کے ختم ہونے کی فکر بالکل نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ یہ سب کچھ جیسے بھلا دیتا ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول میں چھوٹی چھوٹی چیزوں کے پیچھے لگ جاتا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی شمعوں کی تلاش وجستجو میں اپنے آپ کو اس بڑی تاریکی سے دور رکھتا ہے)

(کلیات ص ۴۶۔۴۸)

اتفاق

ملاوائی مغربی تهذیب کړئی لرے — مولوی کہتا ہے مغربی تہذیب کو ہٹاؤ
وکیل وائی مونږ غواړو اصلاحات — وکیل کہتا ہے ہمیں اصلاحات چاہیے
دهقان وائی هائی افسوس باران لاهو کړو — دہقان کہہ رہا ہے ہائے افسوس بارش نے ڈبو دیا
سرکار وائی چه لږ ټیکس به کړو مونږ زیارت — سرکار کہہ رہی ہے کہ تھوڑا سا ٹیکس مزید بڑھانا چاہیے
بوډا پلار وائی فیشن دښځو کار دے — بوڑھا باپ کہہ رہا ہے کہ فیشن کرنا خواتین کا کام ہے
کالجی زوئے وائی په کار دے مساوات — کالج جانے والا بیٹا کہہ رہا ہے کہ ہر چیز میں مساوات ہونی چاہیے
دنیا وائی علم لار دتر قئی ده — دنیا کہتی ہے کہ علم ہی ترقی کا راستہ ہے
مینګل وائی دسقائو پلار نه وو بقراط — مینگل کہہ رہے ہیں کہ سقاؤ کا باپ کوئی بقراط تو نہیں تھا
باچا خان وائی آزاد داخپل وطن کړئی — باچا خان کہہ رہا ہے کہ اپنے اس وطن کو آزاد کراؤ
ملکان وائی اول وران کړه حوالات — ملک کہہ رہے ہیں کہ پہلے حوالات کو توڑو
غنی وے که مادزړه خبرے ووے — غنی کہتا ہے کہ اگر میں اپنے دل کی بات کہوں تو
پښتانه به مې په سرلرګی کړی مات — پشتون ڈنڈے مار مار کر میرا سر پھوڑ دیں گے

(کلیات ص: ۱۳۵)

بابا ته (بابا کے لئے)

غنی کا ایک منظوم خط ہے جو اس نے لندن سے باچا خان کی خدمت میں بھیجا۔ باچا خان ان دنوں جیل میں تھے۔

ستا خطونه تول ځما سرته پراته دي — زه ئې لولم هره شپه دوبار دوباره
کله خاندم کله ژاړم لیونے یم — اے زما په بند کښے پروت غریبه پلاره
نه ته نه ئې غریب ته ډیر لوئے اوچت یې — مصیبت دے ستا عزت ته عزت داره
خدائے به رحم و په تاباندے لږ کړے — بل ښه زوئے به ئې و کتلے ستاد پاره
چه په تا کښې کوم جوهر دے ماکښے نشته — ستانیکئی زما بدی دواړه بے شمار
ته سالارئے د کاروان په نیغه لارځے — زه کوږ ځغلم لکه اوښه بے مهاره
ستاد زړه فوارے ډکے دی دمینے — زما زړه وچ کوهے نه لری یو داره
وهم منلوے تاپسے خوته هم لرے — ویښم ستا ایله ایله دښنو غماره
پروا نشته که په منډو منړومړشم — فقط ستا اور دخپل قام دنوم دپاره

آپ کے بھیجے ہوئے خط تمام میرے سرہانے پڑے ہوئے ہیں۔ میں انہیں بار بار پڑھتا ہوں۔ کبھی ان کو پڑھ کر ہنس دیتا ہوں اور کبھی رو پڑتا ہوں۔ (لگتا ہے) دیوانہ ہوگیا ہوں۔اے میرے جیل میں پڑے ہوئے بے چارے باپ، نہیں نہیں آپ بے چارے نہیں ہیں۔آپ تو ایک عظیم بے حد اونچے اور محترم انسان ہیں۔آپ کی عزت ہی آپ کے لئے مصیبت بن گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرتا اور میری جگہ آپ کو کوئی اور اچھا سے فرزند عطا کرتا۔ کیونکہ آپ میں جو خوبیاں ہیں وہ مجھ میں نہیں ہیں۔آپ کی نیکیاں بے شمار ہیں جبکہ میری برائیاں بہت زیادہ ہیں۔

آپ کارواں کے رہنما ہیں اور سیدھے راستہ پر گامزن ہیں
جبکہ میں ایک بے مہار اونٹ کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر بدکتا پھر رہا ہوں

آپ کے دل میں تو محبتوں کا بھرپور سیلاب ہے

جب کہ میرا دل ایک سوکھے ہوئے کنویں کی مانند ہے جس میں ایک قطرہ پانی بھی نہیں

آپ کے پیچھے دوڑ رہا ہوں آپ تک پہنچنے کے لیے وہ بھی ممکن نہیں کیونکہ آپ دور ہیں

اور میں صرف آپ کے قدموں کا غبار دیکھ پا رہا ہوں

پرواہ نہیں اگر اسی طرح بھاگتے بھاگتے مر بھی جاؤں

فقط صرف آپ کے اور قوم کی خاطر

(کلیات ص ۱۵۶۔۱۵۷)

لکه واخلي چه ماشوم (جب کوئی بچہ اٹھالیتا ہے)

لکه واخلي چه ماشوم	جب کوئی بچہ اٹھا لیتا ہے
ډک شکرے دسرو ګلونو	سرخ پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری
خاندي، چغے وئي غرزئي ئے	ہنستے مسکراتے ہوئے اس کولٹاتا ہے
لړے لړے په موجونو	ہاتھ بھر بھر کے موجوں میں پھینکتا جاتا ہے
دے په غاړه ورته خاندي	وہ کنارے بیٹھ کر اس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے
خړ سیلاب ئے ګلاب یوسي	(اور) سیلاب کا گدلا پانی اس کے گلاب بہا کے لے جاتا ہے
نه په زور د سیلاب پوئیږی	نہ تو اس کو سیلاب کے زور کا پتہ ہے
نه په قدر د ګلونو	نہ اس کو پھولوں کی قدر معلوم ہے
داسے مادا خپل ژوندون	اسطرح میں نے بھی اپنی یہ زندگی
دمستئ سیلاب کښے لاهو که	مستی کے سیلاب میں بہا دی

په خپل لاس مِ ځان بندي کړ	اپنے ہی ہاتھوں آپ گرفتار ہوا
د څو قسمه دوزخونو	کئی قسم کی بندشوں میں
لکه واخلي چه ماشوم	(جب کوئی بچہ اٹھا لیتا ہے
ډک تالے دسرو او سپینو	سونے اور چاندی سے بھرا ہوا ٹوکرا
په خندا خندائے نولی	ہنستے مسکراتے ہوئے وہ اس کو لٹاتا ہے
په کوڅو په بازارونو	گلی کوچوں اور بازاروں میں
غله وائی واه واه دنر ځویه	چور ڈاکو اس کو دیکھ کر کہتے ہیں واہ واہ کیا مرد کی اولاد ہو
څه سخی ارسلان ئے	تم تو بالکل سخی ارسلان خان ہو
دے نه زور دَ دولت وینی	بچہ نہ تو اس دولت کی قدر جانتا ہے
نه دړدونه دَ غمونو	نہ ہی اس کو کسی اور قسم کی پریشانی اور فکر ہے
داسے ما دَ خپل ژوندون	اسی طرح میں نے بھی اپنی یہ زندگی
ورك كه خاورے كه ايرے كه	مٹی اور خاک میں ملا دی
ځان مِ وتړه په خپله	اپنے آپ کو خود ہی
دَ غضب په زنځیرونو	غضب کی زنجیروں میں جکڑ دیا)
یاداژوند بیللے جنگ دے	(یا تو یہ زندگی ایک ہاری ہوئی جنگ ہے
او یا زه پهلوان نه یم	اور یا میں پہلوان نہیں ہوں
ماخو هیڅوک هم او نه لید	میں نے تو اب تک کسی کو بھی نہیں دیکھا

چه زوره ور شوبه غمونو	جس نے غموں کو مات دی ہو)
زه لاویښ نه وم دخوبه - چه نږے ماښکرے شو	(میں ابھی نیند سے بیدار بھی نہیں ہوا تھا کہ سہہ پہر ہوگئی
چه ئې زه په قدر پوهے شوم	میں جب اس کی قدر و منزلت سے واقف ہوا
گلزار تش وود گلونو	تو گلزار کو پھولوں سے خالی پایا
اوس نه رنگ شته نه مستي شته	اب نہ رنگ اور نہ وہ مستی
نه سیلاب شته نه گلونه	نہ سیلاب ہے اور نہ وہ پھول
دیو خوب لیده ووتیر شو	ایک خواب کا دیکھنا تھا جو گذر چکا
ژوند شو ډک دارمانونو	زندگی جیسے خواہشات سے لبریز ہے
باغ د گلوم تاله شو	میرا پھولوں بھرا گلشن اجڑ چکا
دلالونو شکورم تش شو	میرے موتیوں سے بھری ہوئی ٹوکری خالی ہوگئی
دالا واوره ملاجان	ایسے میں ذرا ادھر تو دیکھو مولوی صاحب پر نظر ڈالو
کښې تنگ تنگ دحسابونو	وہ علیحدہ حساب کتاب کی رٹ لگائے ہوئے ہے
وخت اوژوند دغه تقدیر دے	وقت اور زندگی یہی تقدیر ہے
دیو اوره ئې بل له بوتلم	ایک کی سنو گے تو دوسری کی طرف لے جایا گیا
داژوندون وو که یودام وو	یہ زندگی تھی یا ایک دام (فریب) تھا
داورونو دغمونو	(جو کہ) غموں اور دکھوں کا الاؤ تھی

(کلیات ص ۲۷۱-۲۷۲)

اے زما وطنه (اے میرے وطن)

اے زما وطنه دلالونو خزانے زما	اے میرے وطن لعل وجواہر کے خزانے
ستاهره دره کښ دی دتورے نښانے زما	تمہارے ہر ایک درے میں ہے بہادری کی داستانیں میری
ستاسرچه وی ټیټ نوزه به شان او شوکت څه کړم	اگر تمہارا سر جھکا ہوا ہے تو میں شان وشوکت کو کیا کروں
ته چه خواروزاریے زه به مال و دولت څه کړم	اگر تم خوار وزار ہو تو میں مال اور دولت کا کیا کروں
ته چه وران و یجاړیے زه به خوب وراحت څه کړم	تم اگر ویران اور برباد ہو تو میں خواب اور راحت کیا کروں
مسته به دخاوړه کړم په وینه مستانے زما	اپنے لہو سے تمہاری مٹی کو مست بنا دوں گا
اے زما وطنه دلالونو خزانے زما	اے میرے وطن لعل وجواہر کے خزانے
عقل مِ ایرے شه ستاد پاره فکرونونه	میری عقل تمہارے فکروں کی خاطر قربان
سترګے مِ قربان شه ستاد پاره سوچونونه	میرے آنکھیں تمہاری سوچوں کی خاطر قربان
زار شمه، قربان شمه ستاد خاوړود کورونونه	تمہارے مٹی کے بنے ہوئے گھروں کی قربان
ستازړه کښے پرتے دی تولے تلے زمانے زما	تمہارے دل/ سینے میں میرے تمام گذرے ہوئے زمانے پڑے ہیں
اے زما وطنه دلالونو خزانے زما	اے میرے وطن لعل و جواہر کے خزانے)
یا به دِ زه سیال کړم وطنه دجهان	یا تو تمہیں دنیا کی دوسری قوموں کا ہم سیال بنادوں گا
یا به ستاپه خپو کښ تورے خاوړے کړم خپل ځان	اور یا تمہاری خاطر تمہارے قدموں میں خاک بن جاؤں گا
ځان به وړے وړے کړم خوتابه کړم ودان	اپنے آپ کو مٹا کر تمہیں آبادی بخشوں گا

نریمه پښتون یم تا ته یادے افسانے زما	ایک غیرتی پشتون کا بچہ ہوں تمہیں میری بہادری کی داستانیں نہیں یاد ہیں
اے زما وطنه د لالونو خزانے زما	اے میرے وطن لعل و جواہر کے خزانے

(کلیات ص ۳۲۸)

صاحب (صاحب)

زوے مِ راغلے دیورپ د تربیته	میرا بیٹا یورپ سے تربیت پا کر لوٹا ہے
جوړ سنبال لکه دناوے پورته ښکته	ہر وقت دلہنوں کی طرح سنگار کر کے پھرتا رہتا ہے
تریو تندی پوډری مخ ئے وونیولے	پیشانی پر ہزار شکنیں چہرے پر پوڈر کی تہ در تہ جمائے ہوئے
تا به وے ږ د لاټانو د محلته	لگتا ہے جیسے کہ لاٹ صاحب کے محلے کا رہنے والا ہو
دډوډئے او دَ فیشن سره ئے شوق وو	سارا دن کھانے پینے اور فیشن سے شغل لگائے رکھتا ہے
ډیر نفرت ورله ورته د جماعته	اور اس کو مسجد سے بہت نفرت ہو گئی ہے
لګولو د پیسوُ کښے افلاطون وو	پیسے خرچ کرنے میں تو افلاطون ہے
خو ګټلو کښے غریب وو بے همته	لیکن کمانے میں غریب بہت بے ہمت ہے
نن چه ماورته په فکر نظر اوکړو	آج جب میں نے اس کے متعلق غور کیا
خرهم هغه وو بس نوی ئے وه کته	تو لگا کہ گدھا تو وہی پرانا ہے صرف اس پر پالان بدل گیا ہے

(کلیات ص ۴۹۳)

حوالہ جات

۱۔ عبدالغنی خان، د غنی کلیات، کابل، ۱۹۸۶ء، ص ۲۴۷۔

۲۔ عبدالغفار خان، زما ژوندا و جدو جهد، کابل، ۱۹۸۳ء، ص ۱۳۳۔۱۳۴۔

۳۔ Sayed Wiqar Ali Shah, ***Ethnicity, Islam and Nationalism: Muslim Politics in the North West Frontier Province 1937-1947*** **(Karachi - 1999) PP.8-9**

۴۔ **دغنی کلیات**، ص ۶۵۳۔۶۵۴۔

۵۔ انجمن اصلاح الافاغنہ کی مکمل تفصیلات کے لیے دیکھیے: Shah, ***Ethnicity, Islam and Nationalism***, pp. 22-28.

۶۔ احمد، **خدائی خدمتگار تحریک**، پشاور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۱۔ عبدالاکبر خان، اکبر، انجمن اصلاح الافاغنہ ریکارڈ۔

۷۔ عبدالغفار خان، **زما ژوندا و جدو جهد**، ص ۱۸۶۔۳۰۳۔

۸۔ عبدالخالق خلیق، **د آزادئی جنگ** پشاور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۔

۹۔ ذاتی انٹرویو، عبدالغنی کے ساتھ، یکم فروری، ۱۹۸۷ء۔

۱۰۔ خلیق، **د آزادئی جنگ**، ص ۳۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۴۔

۱۲۔ **دغنی کلیات**، ص ۶۵۱۔

۱۳۔ **پښتون**، اتمان زئی، دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۲۹۔۳۱۔

۱۴۔ **دغنی کلیات**، ص ۶۵۱، انٹرویو (ذاتی) یکم فروری ۱۹۸۷ء۔

۱۵۔ **پښتون**، اتمان زئی، جنوری ۱۹۳۰ء، ص ۱۰۔

۱۶۔ **پښتون**، اتمان زئی، مارچ ۱۹۳۰ء، ص ۴۷۔

۱۷۔ **پښتون**، اتمان زئی، اپریل ۱۹۳۰ء، ص ۴۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۔

۱۹۔ **دغنی کلیات**، ص ۱۵۶۔۱۵۷۔

۲۰۔ مکمل تفصیلات کے لیے دیکھیے: Shah, ***Ethnicity, Islam and Nationalism***,

pp.29 38.

۲۱۔ غنی خان سے ذاتی انٹرویو، ۳فروری ۱۹۸۹ء۔

۲۲۔ غنی خان سے ذاتی انٹرویو، ۱۳نومبر ۱۹۹۴ء۔

۲۳۔ غنی خان سے ذاتی انٹرویو، ایضاً۔ اور غنی کے شانتی نکیتن کی کچھ تفصیلات کے لیے مزید دیکھیے: Dinkar Kowshik, ***Nandalal Bose, The Doyen of Indian Act*** **(New Delhi, 1985)p. 84-85.**

۲۴۔ غنی خان انٹرویو، یکم مارچ ۱۹۹۸ء، ***The Frontier Post,*** Peshawar.

۲۵۔ غنی خان ذاتی انٹرویو، ۱۳نومبر ۱۹۹۴ء۔

۲۶۔ **دغنی کلیات**، ص ۲۷۹۔

۲۷۔ غنی خان ذاتی انٹرویو، ۳فروری ۱۹۸۹ء۔

۲۸۔ **خلیق، دآزادی جنگ**، ص ۱۶۲۔

۲۹۔ **دغنی کلیات**، ص ۶۵۸۔۶۵۹ اور اس وقت کے پختون اتمان زئی۔

۳۰۔ Syed Waqar Ali Shah, ***Muslim League in NWFP***, Karachi, 1992,pp. 64-71.

۳۱۔ Shah, ***Ethnicity, Islam and Nationalism***, pp. 159-167.

۳۲۔ Shah, ***Ethnicity, Islam and Nationalism***, pp. 169-175.

۳۳۔ Ibid. pp. 203-210.

۳۴۔ غنی خان ذاتی انٹرویو، ۱۳نومبر ۱۹۹۴ء

۳۵۔ غنی خان ذاتی انٹرویو، ۳فروری ۱۹۸۹ء، پختون، اتمان زئی، یکم جولائی ۱۹۴۷ء، ص ۷ اور **مدینہ بجنور**، ۱۱اگست ۱۹۴۷ء۔

۳۶۔ ان تفصیلات کے لیے دیکھیے: Shah, ***Ethnicity, Islam and Nationalism***, pp. 217-227.

۳۷۔ سید مقبل علی شاہ، **پیر صاحب مانکی شریف سید امین الحسنات اور ان کی سیاسی جدوجہد**، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص ۸۸۔۹۱۔

۳۸۔ یہ سب تفصیلات غنی نے اپنے ذاتی انٹرویو میں بیان کیں۔ ذاتی انٹرویو ۳ فروری ۱۹۸۹ء۔

۳۹۔ D.G. Tendulkar, ***Abdul Ghaffar Khan***, Bombay, 1967, pp.464-466

۴۰۔ **غنی کلیات**، ص ۶۶۰۔